فسادِ جہل

ملک صفدر حیات
(ریٹائرڈ ڈی ایس پی)



جرم وسزا اور تفتیش کی ناقابل فراموش کہانیاں
جو انسانی حرص وہوس کا آئینہ ہیں

فسادِ جہل

راوی

ملک صفدر حیات
(ریٹائرڈ ڈی ایس پی)

تحریر

حسام بٹ

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958
www.alquraish.com email: info@alquraish.com

پیش منظر

کسی اللہ کے بندے نے کیا خوب کہا ہے..... کہ رائی ہوتو پہاڑ بنتا ہے' یہ الگ بات کہ بعض اوقات پہاڑ کھودنے پر ایک چوہا برآمد ہوتا ہے اور کبھی وہ بھی نہیں۔ بہرحال' کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بڑی بن جاتی ہیں۔ زیر نظر کہانی بھی اس فلسفے کے گرد گھومتی ہے۔

وہ ماہ اپریل کے وسطی ایام تھے۔ موسم گرما نے اپنے پر کھول لئے تھے۔ ابھی فضا میں وہ حدت اور شدت تو پیدا نہیں ہوئی تھی' لیکن پھر بھی بلاجھجک بڑے اعتماد سے کہا جاسکتا تھا کہ گرمیاں شروع ہوچکی تھیں۔

میں ان دنوں ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیرآباد کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ ایک روز میں حسب معمول تھانے سے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آکر اطلاع دی۔

''ملک صاحب' ادھر سوہدرہ میں قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے......!''

موضع سوہدرہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا بلکہ یہ تھانہ سوہدرہ ہی سے زیادہ قریب تھا۔ میں تھانے سے نکل کر دس پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے اطلاع لے کر آنے والے کانسٹیبل سے استفسار کیا۔

''تجمل! تم کس کے قتل کی بات کررہے ہو؟''

''جناب! اس شخص کا نام تو عبدالغفار ہے لیکن علاقے کے لوگ اسے ''ماموں'' کہتے ہیں۔'' تجمل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''قصبے کے مین بازار میں ماموں کی تکے کباب کی دکان ہے...... آپ اسے جگت ماموں سمجھ لیں۔''

"سمجھ لیا......" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اب آگے بتاؤ کہ تمہیں یہ خبر کس نے دی اور ماموں کا قاتل کون ہے؟"

"قاتل کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا مگر صاحب!" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "ادھر جائے وقوعہ سے دو بندے آئے ہیں' اس واقعہ کی اطلاع لے کر۔ وہ باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ آپ کا حکم ہو تو انہیں اندر بلا لوں......؟"

"کسی بھی مثبت اور نیک کام کیلئے میری اجازت یا حکم کی ضرورت نہیں ہے تجمل!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم ان بندوں کو فوراً میرے پاس لے آؤ۔"

"جو حکم ملک صاحب!" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

ایک منٹ کے بعد وہ دوبارہ میرے سامنے موجود تھا اور اس بار تجمل کے ساتھ دو افراد بھی تھے۔ میں نے ان کے نام اور کام دریافت کئے' پھر پوچھ گچھ شروع کر دی۔

ایک شخص کا نام مشتاق احمد تھا۔ وہ بھاری بھرکم اور پستہ قامت تھا۔ اس نے اپنے ڈیل ڈول کی مناسبت ہی سے خاصی صحت مند مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ وہ ماموں کی تکا کباب والی دکان کے ساتھ گنڈیری کی ریڑھی (ٹھیلا) لگاتا تھا جبکہ دوسرے بندے کا نام جنید خان تھا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا مالک تھا اور یہ بھی ماموں کی دکان کے قریب ہی پھل فروخت کیا کرتا تھا۔

"ہاں بھئی......" میں نے باری باری مشتاق اور جنید کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "ماموں کو کس نے قتل کیا ہے اور کیوں......؟"

"تھانیدار صاحب! یہ تو کسی کو بھی پتا نہیں کہ وہ شخص کون تھا جس نے طیش میں آ کر چھری سے ماموں پر حملہ کر دیا تھا۔" جنید نے الجھن زدہ انداز میں بتایا۔ "اور جہاں تک "کیوں" کا سوال ہے تو میں نے خود دیکھا تھا کہ اس واقعہ سے پہلے ماموں اور اس شخص میں خاصی بحث وتکرار ہو رہی تھی۔"

"یہ بات تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو کہ کسی کو بھی نہیں پتا کہ قاتل کون شخص تھا؟" میں نے ایک بار پھر سوالیہ نظر سے ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ "کوئی تو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا......!"

"یہی تو مسئلہ ہے تھانیدار صاحب!" مشتاق پریشانی سے بولا۔ "وہ سب کیلئے اجنبی

تھا۔ میں نے اور جنید نے اسے سوہدرہ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔" میں نے غیر مطمئن انداز میں کہا۔ "ایک ایسا شخص جسے موضع سوہدرہ میں کوئی بھی نہیں جانتا' اس کی ماموں کباب والے سے بھلا کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"تھانیدار صاحب!" جنید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں' یہ افسوسناک واقعہ کسی دشمنی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہاں جو کچھ پیش آیا وہ وقتی اشتعال کے سبب تھا۔ ماموں اور اس اجنبی شخص میں کسی بات پر "تو تو میں میں" ہوئی اور اس شخص نے ماموں کی چھری اٹھا کر اسی پر آزما ڈالی......"

"تم لوگ چلو میرے ساتھ۔" میں نے ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد کہا۔ "جائے وقوعہ پر چل کر دیکھتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے......؟"

میں نے تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے کا پروگرام مؤخر کر دیا اور کانسٹیبل صفدر کو اپنے ساتھ لے کر جائے واردات کی جانب روانہ ہو گیا' حالانکہ اس وقت مجھے بڑی شدید نوعیت کی بھوک محسوس ہو رہی تھی' لیکن فرض کی ادائیگی آپ کی ذات اور ضروریات سے ہمیشہ زیادہ اہم ہوتی ہے۔

جس طرح گاہک اور موت کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہوتا' بالکل ویسے ہی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایمرجنسی کا کوئی اسکیجوئل طے نہیں ہوتا اور خاص طور پر تھانیدار تو چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی ہوتا ہے' لیکن شرط وہی ہے اگر وہ اپنے فرائض کو پہچانتا ہو تو' ورنہ بعض تھانے اور بعض تھانیدار تو ایسے بھی ہیں کہ ان کیلئے راوی' چناب' جہلم' ستلج اور سندھ...... سب کے سب سکھ چین ہی لکھ رہے ہوتے ہیں۔

جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو وہاں ایک دوسری اور انتہائی مختلف صورتحال سے واسطہ پڑا۔ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ سوہدرہ کے مین بازار میں تکے کباب کی دکان پر ماموں تکا فروش کی لاش پڑی ہوگی اور کوئی دو درجن افراد اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہوں گے' لیکن وہاں ایک نیا نقشہ دیکھنے کو ملا۔

ماموں کی دکان پر چند لوگ جمع تھے اور آپس میں بڑے گھمبیر انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ ماموں کی لاش کا دور دور تک نام ونشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس صورتحال نے مجھے ذہنی

طور پر الجھا دیا اور میں نے اپنے ساتھ آنے والوں سے پوچھا۔

''مشتاق...... جنید...... یہ کیا تماشا ہے۔ تم لوگوں نے بتایا تھا کہ کسی اجنبی لفنگے نے ماموں کا قتل کر دیا ہے' مگر یہاں تو......؟''

''جناب! جب ہم آپ کو اطلاع دینے گئے تھے تو ماموں ادھر ہی گرا پڑا تھا۔'' جنید نے زمین کے ایک حصے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں بتایا۔ ''پتا نہیں' اب کہاں غائب ہو گیا ہے......!''

''وہ کہیں غائب نہیں ہوا سرکار!'' وہاں موجود لوگوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''چند لوگ ماموں کو تانگے میں ڈال کر کلینک لے گئے ہیں۔''

''کلینک......؟'' میری حیرت دوچند ہو گئی۔ ''ایک لاش کو کلینک لے گئے ہیں......؟''

''جی ہاں۔'' وہی پختہ عمر شخص وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب مشتاق اور جنید کو ہم نے تھانے کی طرف دوڑایا تھا تو اس وقت یہی لگ رہا تھا' ماموں کا ''کام'' ہو گیا' مگر ان کے جانے کے دو منٹ بعد ہی بے حس و حرکت پڑے ماموں میں اچانک حرکت پیدا ہوئی اور وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ موقع پر موجود لوگوں نے ایک تانگا لا کر اس میں ماموں کو ڈالا اور ڈاکٹر عباس کے کلینک لے گئے ہیں۔'' وہ سانس ہموار کرنے کیلئے تھما' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹر عباس کا کلینک تھوڑی دور ادھر مین بازار ہی میں ہے۔''

وہ تحمل مزاج شخص خاصا سمجھ دار اور بردبار نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پچپن سے متجاوز تھی۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''چاچا! آپ کا نام کیا ہے؟''

''فرید بخاری!'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن لوگ صرف بخاری یا بخاری صاحب کہتے ہیں۔''

''بخاری صاحب! آپ بھی ادھر ہی رہتے ہیں؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''جی ہاں...... بالکل......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہم لوگ تین' چار پیڑھیوں سے ادھر ہی رہ رہے ہیں جی۔ میں پاک فوج میں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ریٹائر ہوا

ہوں۔''

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی بخاری صاحب!'' میں نے اس سے گرم جوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے' آپ قانون سے اپنے بھرپور تعاون کا اظہار کریں گے۔''

''آپ حکم کریں انچارج صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھ سے جو بھی ہو سکا' ضرور کروں گا۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ ماموں پر حملہ کرنے والا شخص اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتا۔'' میں نے فرید بخاری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جتنے بھی لوگوں نے اسے دیکھا' ان سب کیلئے وہ اجنبی تھا۔ کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟''

''جی ہاں' ابھی تھوڑی دیر پہلے اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے تو اس شخص کو دیکھا نہیں' مگر لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ آج سے پہلے اسے اس علاقے میں کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔''

''جب اس نے ماموں پر حملہ کرنے کے بعد یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو کسی نے آگے بڑھ کر اسے روکا یا پکڑا کیوں نہیں؟'' میں نے خاصے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''تھانیدار صاحب! جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں......'' وہ تجزیاتی انداز میں بولا۔ ''جب اس نے اچانک ماموں پر وار کیا ہو گا اور ماموں نیچے زمین پر گر گیا ہو گا تو یہاں موجود لوگوں کی تمام تر توجہ ماموں کی جانب مبذول ہو گئی ہو گی اور کسی نے اس شخص پر دھیان نہیں دیا ہو گا۔ لہٰذا وہ بڑی آسانی سے فرار ہونے میں کامیاب رہا......''

فرید بخاری کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایمرجنسی کی صورت میں عموماً عوام اسی طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے' جب ماموں پر حملہ ہوا' آپ یہاں موجود نہیں تھے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''جب میں یہاں پہنچا تو یہ واقعہ پیش آ چکا تھا اور حملہ آور یہاں سے فرار ہو گیا تھا البتہ......'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔

''البتہ' جنید اور مشتاق میرے سامنے ہی آپ کو اطلاع دینے تھانے کی طرف گئے تھے

اور جب ماموں کے جسم میں حرکت ہوئی تو میں نے فوراً اسے دو افراد کی نگرانی میں ایک تانگے میں ڈال کر عباس کلینک بھجوا دیا۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اور اب اس سے بھی زیادہ ایک اور اچھا کام آپ کو کرنا ہے......''

''جی وہ کیا......؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''آپ ایک ریٹائرڈ فوجی ہیں' اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ یہ کام بڑی آسانی سے کرلیں گے......''

''آپ حکم تو کریں تھانیدار صاحب!'' وہ بڑے جوش میں بولا۔ ''میرے بس میں جو بھی ہوا' ضرور کروں گا۔''

''میں تو ابھی فوری طور پر عباس کلینک جا رہا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تک میں واپس نہیں آ جاتا' یہاں کی صورتحال آپ سنبھالیں گے۔''

''جی ضرور سنبھالوں گا۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بتائیں' مجھے کیا کرنا ہوگا......؟''

''نمبر ایک...... جائے وقوعہ کی جو چیز جہاں پڑی ہے وہ وہاں سے ہلنا نہیں چاہئے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سلسلے میں میرا کانسٹیبل بھی آپ کی مدد کرے گا۔'' میں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبل صفدر کی جانب اشارہ کیا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نمبر دو...... آپ یہاں پر موجود افراد میں سے کم از کم دس ایسے لوگوں کا چناؤ کریں گے جنہوں نے حملہ آور کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھتے ہی فوراً پہچان سکتے ہوں...... پورے دعوے کے ساتھ۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی ہاں' بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' وہ پرمعنی انداز میں بولا۔ ''آپ بے فکر ہو کر کلینک جائیں۔ یہ دونوں کام ہو جائیں گے۔''

میں نے کانسٹیبل صفدر کو ضروری ہدایات دیں' پھر زخمی ماموں کو دیکھنے عباس کلینک کی جانب روانہ ہو گیا۔



عبدالغفار عرف ماموں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ وہ اس قابل تو نہیں تھا کہ

میں اس کا بیان قلمبند کرسکتا' تاہم ڈاکٹر نے اس کے خطرناک زخم پر ٹانکے لگا کر مرہم پٹی کردی تھی اور اسے انجکشن بھی لگا دیا تھا' جس کے زیر اثر وہ اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔

میں نے تنقیدی نظر سے ماموں کا جائزہ لیا' پھر ڈاکٹر عباس کے پاس آ بیٹھا۔ عباس کلینک دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ابتدائی حصے میں وہ خود بیٹھ کر مریضوں کو دیکھتا تھا اور عقبی حصہ ایمرجنسی مریضوں کیلئے تھا' جہاں ڈرپ والے مریضوں کو لٹایا جاتا تھا یا پھر ایسے مریضوں کو جن کی حالت بہت زیادہ خراب ہو۔ ماموں اسی حصے میں سکون کی نیند سو رہا تھا۔ ان دونوں حصوں کی بیچ میں ایک لمبوتری سی قبرنما ڈسپنسری بنی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر عباس معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''تھانیدار صاحب! یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس تھا اور میں نے آپ کی اجازت کے بغیر ہی مریض کو ٹریٹمنٹ دے دیا ہے......''

''آپ نے بہت اچھا کیا ڈاکٹر صاحب!'' میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ایک شخص کی جان بچانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں سو فیصد کامیاب بھی رہے ہیں۔ گویا...... آپ نے پوری انسانیت کو بچا لیا ہے۔''

وہ میرے آخری جملے کی گہرائی میں اتر کر اس کی معنویت کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر تو صرف کوشش ہی کرتا ہے۔ زندگی بچانے یا زندگی دینے والی تو خدا ہی کی ذات ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''انسان محض مثبت اور منفی کوشش کرتا ہے۔ زندگی اور موت دینے کا اختیار صرف اسی قادر مطلق کو ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے پوچھا۔

''ماموں کی کیا پوزیشن ہے؟''

''وہ میرے حساب سے اب بالکل ٹھیک ہے۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔'' وہ تسلی بھرے انداز میں بولا۔ ''گردن پر گہرا زخم آیا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں' تیز دھار آلے کا کٹ کتنا ظالم ہوتا ہے۔ بہرحال' میں نے ٹانکے وغیرہ لگا کر زخم اچھی طرح سی دیا ہے۔ ہفتہ دس دن میں ماموں بھلا چنگا ہو جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ماموں کو جو لوگ یہاں لے کر آئے تھے' ان میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ وہ کہاں چلے گئے ہیں؟''

"ماموں کے ساتھ دو بندے آئے تھے تھانیدار صاحب!" ڈاکٹر نے بتایا۔ "ایک کا نام سبحان ہے۔ وہ اب ماموں کی بیوی کو اس واقعہ کی اطلاع دینے گیا ہے۔ میرا خیال ہے' وہ ماموں کی بیوی کو ساتھ ہی لے کر آئے گا اور پھر ماموں کو کلینک سے گھر بھی وہی پہنچائے گا۔"

"اور دوسرا آدمی کون تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"سلو!" ڈاکٹر مہاس نے جواب دیا۔ "سلامت علی عرف سلو نامی یہ نوجوان ماموں کی دکان پر ملازم ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ یہیں تھا' ہوسکتا ہے کہ ادھر باہر کہیں کھڑا ہو۔ میں دیکھتا ہوں اسے..."

ڈاکٹر نے بات مکمل کرنے کے بعد اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ گھونگھریالے بالوں والا ایک پستہ قامت نوجوان کلینک میں داخل ہوا۔ اس کی عمر بیس' بائیس سال رہی ہوگی۔ رنگت گندمی اور آنکھوں کے انداز میں ایک خاص قسم کی تیزی و طراری تھی۔ اس نوجوان پر نگاہ پڑتے ہی ڈاکٹر مہاس نے بڑی سرعت سے کہا۔

"تھانیدار صاحب! لیں سلو بھی آ گیا......"

سلامت علی عرف سلو نے مجھے سلام کیا۔ وہ اس واقعہ کا چشم دید گواہ تھا۔ لہٰذا میں اسے لے کر ایک طرف بیٹھ گیا اور اس سے مختلف سوالات کرنے لگا۔

"کیا تم اس شخص کو جانتے ہو جس نے ماموں پر حملہ کیا تھا؟" میں نے سلو سے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب مجھے ابھی تک کہیں سے موصول نہیں ہوا تھا۔

"جی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں نے اس بندے کو زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ میری ساری عمر ادھر سوہدرہ ہی میں گزری ہے جناب۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ادھر کا رہنے والا نہیں تھا۔"

"جب وہ فرار ہو رہا تھا تو تم نے اسے پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "وہ تمہارے مالک کو مار کر جا رہا تھا...... اور تم نے اسے جانے دیا......!"

"تھانیدار صاحب!" وہ آنکھوں کو مخصوص انداز میں گھماتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں بولا۔ "میں نے جب ماموں کو گرتے دیکھا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ادھر لپکا تھا۔ میں نے فوراً ماموں کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ اس شخص پر تو میرا بالکل دھیان نہیں گیا تھا' اسے پکڑنے کی

کیا کوشش کرتا جی......"

"اس معاملہ میں تم اکیلے نہیں ہو سلو!" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "وہاں موجود کسی بھی شخص نے اسے روکنے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہرحال......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس شخص کی ماموں سے ایسی کون سی دشمنی تھی جو وہ چھری سے اس پر حملہ آور ہو گیا......؟"

"جناب! دشمنی تو کوئی نہیں تھی' بس وہ بندہ بدمعاشی کر رہا تھا اور ماموں کو اس کی بے ایمانی پر غصہ آ گیا۔" سلو نے بتایا۔ "دونوں میں بحث ہونے لگی' پھر اس بندے نے ماموں کے سامنے رکھی چھری اٹھائی اور اس کی گردن پر وار کر دیا......"

"وہ بندہ کس قسم کی بدمعاشی کر رہا تھا۔" میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے اس کی بے ایمانی کا ذکر کیا ہے۔ ماموں سے وہ کس معاملہ پر بحث کر رہا تھا؟"

"میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "وہ بندہ ہمارے پاس تکے کباب کھانے آیا تھا۔ اس نے پہلے ایک چکن تکا' چار سیخ کباب کا آرڈر دیا۔ میں نے اس کی مطلوبہ چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس وقت اس بندے کے علاوہ بھی تین چار لوگ تکا بوٹی وغیرہ کھا رہے تھے اور سب پر میری نظر تھی۔ کسی کو پانی چاہئے تو کسی کو چٹنی پیاز وغیرہ کی ضرورت تھی اور کسی کے پاس روٹی ختم ہو گئی تھی۔ میں ہر گاہک کی آواز پر اس کی ضرورت پوری کر رہا تھا......" اس نے سانس ہموار کرنے کیلئے توقف کیا' پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اس بندے نے دو روٹیاں فوراً ہی معدے میں اتار لی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا' اس نے پچھلے دو چار دن سے کھانا نہ کھایا ہو۔ اس نے مجھ سے اور روٹیاں لانے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی ایک چکن تکا کا مزید آرڈر بھی دے دیا۔ میں نے روٹیاں تو فوراً اس کے سامنے رکھ دیں اور چکن تکا میں پانچ چھ منٹ لگ گئے ہوں گے۔ اس دوران میں وہ سیخ کباب کے ساتھ روٹی کھاتا رہا۔ بہرحال...... اس نے کھانا ختم کیا اور پیسے دینے کیلئے ماموں کے پاس پہنچ گیا۔ جب کوئی گاہک ماموں کو پیسے دینے لگتا ہے تو ماموں مجھے آواز دے کر پوچھتا ہے کہ اس شخص

کا کیا حساب بنا ہے۔ ماموں میرے آرڈر پر تکے کباب اور بوٹی وغیرہ انگیٹھی پر سینکتا رہتا ہے۔ گاہکوں کا حساب رکھنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ تو جناب...... جب وہ بندہ ماموں کے پاس پہنچا تو ماموں نے مجھے پکارا۔

''ہاں بھئی سلو! کیا حساب ہے اس بندے کا؟''

''ماموں! اس بندے کے دو چکن تکا' چار سیخ کباب اور چار روٹیاں ہیں۔'' میں نے اس بندے کے کھانے کا حساب لگا کر بتا دیا۔

ماموں نے فوراً پیسے بتا دیئے۔ وہ شخص ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے ماموں سے بولا۔

''چاچا! تم نے بڑا بے ایمان نوکر رکھا ہوا ہے......''

''کیا ہو گیا بھائی جی......؟'' ماموں نے چونک کر پہلے مجھے اور پھر اس بندے کی طرف دیکھا۔

''ہونا کیا ہے چاچا......'' وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔ ''میں نے ایک چکن تکا' چار کباب اور دو روٹیاں کھائی ہیں اور یہ تمہارا نوکر دو چکن تکے اور چار روٹیاں حساب میں لگا رہا ہے۔ یہ تو کھلی بے ایمانی ہے......!''

''سلو نے کبھی ایسا کیا تو نہیں۔ مجھے اس کے حساب پر پورا بھروسہ ہے۔'' ماموں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''سلو...... ان بھائی جی کا کیا مسئلہ ہے؟''

''یہ بندہ خود ہی اپنے لئے مسئلہ ہے ماموں۔'' میں نے تلخی بھرے انداز میں کہا۔ ''میرا حساب بالکل ٹھیک ہے جی۔ لگتا ہے' اس بندے کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ تکے کباب تو یہ کھا ہی چکا ہے' اب یہ ایک چکن تکا اور دو روٹیوں کے پیسے بھی ہضم کرنا چاہتا ہے......''

''چاچا! دیکھو تو' اس لڑکے کی زبان کیسے قینچی کی طرح چل رہی ہے۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے' یہ اس دکان کا مالک اور تم نوکر ہو چاچا......؟''

''بھائی جی' آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہے۔'' ماموں نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''سلو بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ اس کا حساب ٹھیک ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے' میں فراڈ کر رہا ہوں۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے' تم دونوں

ہی آپس میں ملے ہوئے ہو۔ لوگوں کو الو بنا کر ان سے زیادہ رقم بٹورتے ہو' لیکن میں ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں دوں گا۔''

''بھائی جی! اگر تمہاری جیب میں پیسے نہیں ہیں تو صاف بتا دو' میں تمہیں پیسے چھوڑ دوں گا۔'' ماموں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ الٹے سیدھے ڈرامے کیوں ڈال رہے ہو......؟''

ماموں غصے کا بہت تیز ہے۔ مجھے تو حیرت تھی کہ وہ اس بندے کی زیادتی کے باوجود بھی بڑی نرمی سے ''بھائی جی' بھائی جی'' کہہ کر اس سے بات کیوں کر رہا تھا۔ بہرحال' جب اس بندے نے اپنی غلط بات جاری رکھی تو ماموں زیادہ دیر تک خود پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور اس کی آواز بھی بلند ہو گئی۔ جبھی اس نے ڈرامہ ڈالنے والی بات کی تھی۔

''ڈرامہ میں نہیں' تم دونوں مل کر کر رہے ہو۔'' وہ بندہ خاصی بدتمیزی سے بولا۔ ''میری جیب میں اتنی رقم ہے کہ میں تمہاری یہ دکان کھڑے کھڑے خرید سکتا ہوں' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم لوگوں کے ہاتھوں بیوقوف بن کر آسانی سے لٹ جاؤں گا۔''

ماموں نے اب بندے کا یہ سٹائل دیکھا تو سلگانے والے انداز میں کہا۔ ''سنو بھائی! انسان زندگی میں دو چیزوں کو کبھی بھول نہیں سکتا' چاہے اس کی یادداشت بھی کیوں نہ چلی جائے......''

''کون سی دو چیزیں؟'' وہ بگڑے ہوئے انداز میں بولا۔

''نمبر ایک......'' ماموں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''کسی کا کھایا ہوا مال' نمبر دو......'' لمحاتی توقف کے بعد ماموں نے اضافہ کیا۔ ''کسی سے کرایا ہوا کوئی برا کام......!''

''اوئے بڈھے! تم نے مجھے گالی دی......'' وہ بندہ ماموں کی حقیقت بیانی سنتے ہی طیش میں آ گیا۔ ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

بات ختم کرتے ہی اس نے ماموں کے سامنے رکھی چھری اٹھا لی اور اس سے پہلے کہ ماموں اس کے ارادے کو بھانپ پاتا' اس کم بخت نے ماموں کی گردن پر چھری کا وار کر دیا۔ ماموں چھری کھاتے ہی زمین پر گر گیا اور میں اسے دیکھنے کیلئے آگے بڑھا۔ اس کے بعد کیا ہوا' مجھے کچھ خبر نہیں جناب......''

''ہوں......!'' سلو خاموش ہوا تو میں نے گھمبیر انداز میں کہا۔''اس کے علاوہ اگر تمہیں کوئی خاص بات پتا ہو تو بتاؤ؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔''میں جو کچھ جانتا تھا وہ آپ کو پوری تفصیل سے بتا دیا ہے۔اس کے سوا مجھے اور کچھ بھی پتا نہیں۔''

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سبحان' ماموں کی بیوی کو لے کر آ گیا۔ ماموں کی گھر والی کا نام غفوری تھا اور وہ بھی ماموں کی طرح جگت مامی (ممانی) تھی۔ وہ سانولی رنگت کی مالک ایک پستہ قامت عورت تھی اور پچاس کے پیٹے میں دکھائی دیتی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے بارے میں ایک خاص بات' جو بعد میں مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ لوگ بے اولاد تھے۔

میں نے غفوری مامی کو تسلی تشفی دی اور کہا۔''تم فکر نہ کرو' ماموں دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ معمولی سا زخم آیا ہے گردن پر۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا ہے' یہ اپنے کمپاؤنڈر کو گھر بھیج کر ماموں کی پٹی وغیرہ کروا دیا کریں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو انجکشن وغیرہ بھی لگوا دیں گے۔ اب تم ماموں کو گھر لے جاؤ اور یہ جتنا زیادہ آرام کریں' کرنے دیں۔''

''اللہ تمہارا بھلا کرے تھانیدار پتر۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔''لیکن وہ حرامی تھا کون جس نے ماموں پر چھری سے حملہ کر دیا......؟''

عبدالغفار کا یہ ''ٹائٹل'' ایسا مقبول عام تھا کہ اس کی بیوی بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے ''ماموں'' ہی کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔

''اس بندے کے بارے میں ابھی تک کوئی پتا نہیں چل سکا' لیکن مجھے امید ہے' بہت جلد میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ پھر پتا چل جائے گا' وہ سورما ہے کون......!''

''سوہدرہ کا تو بچہ بچہ ماموں کو جانتا ہے۔'' مامی غفوری نے کہا۔''میں جانتی ہوں' وہ غصے کا تھوڑا تیز ہے' لیکن کسی کی مجال نہیں کہ چھری سے اس پر حملہ آور ہو۔ یہاں کے سب لوگ اس کے غصے سے واقف ہیں۔''

''لیکن مسئلہ یہ ہے مامی......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''ایک تو وہ بندہ سوہدرہ کا رہنے والا نہیں تھا' اس لئے وہ ماموں کے مزاج سے واقف نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ وہ کم بخت غصے کا خود بھی بہت تیز تھا۔ ماموں نے تو آرام ہی سے بات کرنے کی کوشش کی تھی

پر وہ ماموں کے ایک جملے کو برداشت نہ کر سکا اور طیش میں آ کر اس نے چھری سے ماموں پر حملہ کر دیا۔''

''جب وہ ادھر کا رہنے والا نہیں تو پھر اس کی ماموں سے کیسی دشمنی؟'' مامی غفوری نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''بس' پیسوں کے لین دین پر ان میں منہ ماری ہو گئی تھی۔'' میں نے اپنی معلومات کے مطابق کہا۔''اس کے کھانے کا جو بل بنا تھا وہ اس سے کم دے رہا تھا......''

''میں ماموں کو پچھلے تیس سال سے جانتی ہوں۔'' مامی غفوری نے بڑے اعتماد سے کہا۔''وہ غصے کا ذرا تیز ضرور ہے لیکن دل کا برا نہیں اور...... بے ایمان یا دھوکے باز ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''بہرحال خدا کا شکر ادا کرو کہ ماموں کی جان بچ گئی ورنہ اگر زخم ذرا اور گہرا لگ جاتا تو شہ رگ کٹنے کا بڑا قوی امکان تھا۔''

''آپ نے بتایا ہے کہ وہ بندہ سوہدرہ کا رہنے والا نہیں۔'' مامی غفوری آنکھیں سکیڑ کر سوچنے والے انداز میں بولی۔''اس کا مطلب ہے' وہ کوئی مہمان ہو سکتا ہے۔''

''مہمان...... کس کا مہمان؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ تو مجھے پتا نہیں جناب......'' وہ جلدی سے بولی۔''جب وہ یہاں کا وسینک نہیں تو پھر کسی کے گھر آیا ہوا کوئی مہمان ہی تو ہو سکتا ہے...... کسی کا بھی مہمان......!''

غفوری مامی نے ایک اہم پہلو کی جانب توجہ مبذول کرائی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ بندہ کسی کا مہمان ہو لیکن اس صورت میں فوراً ایک سوال اٹھتا تھا کہ اگر وہ کسی کے گھر آیا ہوا کوئی مہمان تھا تو پھر اسے ماموں کی دکان پر بیٹھ کر تکے کباب کھانے کی کیا ضرورت تھی اور اگر ضرورت پیش آ ہی گئی تھی تو وہ اکیلا کیوں تھا' اس کے ساتھ گھر کا کوئی آدمی کیوں نہیں تھا۔ اگرچہ اس پہلو پر بہت سارے سوالات اٹھتے تھے' لیکن اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غفوری مامی کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔

''میں اس حوالے سے بھی لوگوں کو چیک کرنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے غفوری مامی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ نامراد جو کوئی بھی ہے' بہت جلد میری گرفت میں ہو گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو تھانیدار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اور جب وہ آپ کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کا دیدار مجھے بھی کرائیں۔ میں سانس روک کر اس کے سر میں پورے سات جوتے ماروں گی اور پوچھوں گی...... بتا' ماموں نے تیری کون سی بھانجی کو چھیڑا تھا جو تو نے اس پر چھری اٹھائی......؟''

یہ ماموں کی گھر والی ''جگت مامی غفوری'' بھی مزاج اور غصے کی کچھ سست نظر نہیں آتی تھی۔ وہ چار جملوں ہی نے اس کے سٹائل کا تعارف پیش کر دیا تھا۔

''وہ شخص جب بھی میرے قابو میں آیا میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔ میں کل کسی وقت اس کا بیان لینے آؤں گا۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں نے سبحان نامی اس بندے کے ہمراہ ماموں اور مامی کو عباس کلینک سے ان کے گھر کی جانب روانہ کر دیا۔ سبحان کے بارے میں مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ ماموں کا پڑوسی تھا اور سوہدرہ کے مین بازار ہی میں اس کی کریانے کی دکان تھی۔

ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب میں اپنی کہانی میں کسی گاؤں دیہات کے ''مین بازار'' کا ذکر کرتا ہوں تو اس کا مطلب ہرگز ہرگز لاہور' کراچی یا راولپنڈی جیسا مین بازار نہیں ہوتا۔ گاؤں دیہات کے مین بازار کا مطلب ہے' کسی بھی مرکزی گلی میں مختلف نوعیت کی چند دکانیں!

ماموں اور مامی کو ان کے گھر بھجوانے کے بعد میں سلامت علی عرف سلو کے ساتھ جائے واردات کی جانب روانہ ہو گیا۔



فرید بخاری نے کسی فیلڈ مارشل کا کردار ادا کیا تھا۔

جب میں واپس ماموں تکا فروش کی دکان پر پہنچا تو ہر شے جوں کی توں تھی۔ میں فوری طور پر جائے وقوعہ کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ اصولی طور پر یہ کام مجھے سب سے پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن جب مجھے پتا چلا کہ ماموں کی ''لاش'' کو کسی کلینک بھجوایا جا چکا ہے تو میں فوراً ادھر لپک گیا تھا۔ میں تو ماموں کے قتل کی اطلاع پا کر تھانے سے نکلا تھا اور پھر پے در پے صورتحال میں تبدیلی رونما ہوتی چلی گئی۔ اگر ماموں ایسا ہی شدید زخمی ہو چکا تھا تو پھر اسے سوہدرہ کے کسی کلینک نہیں بلکہ وزیر آباد کے سرکاری ہسپتال لے جانے کی ضرورت تھی۔ یہی تشویش مجھے جائے وقوعہ سے کھینچ کر ڈاکٹر عباس کے کلینک پر لے گئی تھی۔

میں نے پندرہ بیس منٹ تک کانسٹیبل صفدر کے تعاون سے جائے واردات کا مکمل معائنہ کر ڈالا۔ وہ بنیادی طور پر ایک چھوٹی سی دکان تھی جس کے آگے ایک بڑے سے چوبی تخت پر ماموں نے اپنی دکان داری سجا رکھی تھی۔ کوئلوں والی ایک بڑی سی انگیٹھی کے برابر میں تکا اور بوٹی کباب کی سیخوں والا اسٹینڈ تھا۔ دوسری جانب ایک بڑے سے تسلا نما برتن میں ''مال'' بھرا ہوا تھا۔ تکے' بوٹی اور کباب کے اس مال کو مسالا لگا کر بالکل تیار حالت میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اب اسے سیخ میں پرو کر کوئلوں پر سینکنے کی ضرورت تھی۔

جس گدی نما سیٹ پر ماموں براجمان ہو کر تکے کباب تیار کرتا تھا وہ دراصل لکڑی کی بنی ہوئی ایک چوکی تھی' جس کے زیریں حصے میں دو درازیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ جن میں ماموں اپنی بکری کی رقم رکھا کرتا تھا۔ اسی چوکی کے اوپر روئی والی گدی رکھ کر ماموں نے اپنے بیٹھنے کی جگہ بنا رکھی تھی۔ اسی چوکی کی دائیں جانب چٹنی اور پیاز والے دو تسلے رکھے ہوئے تھے اور ایک چھوٹے سے برتن میں گھی بھی نظر آ رہا تھا۔

چوبی تخت کے آگے ماموں نے گاہکوں کیلئے لکڑی ہی کی چار پانچ بینچیں ڈال رکھی تھیں جہاں بیٹھ کر وہ لوگ اپنے معدوں کو خوش کیا کرتے تھے۔ آج کل کے دور کی زبان میں یوں کہیں گے کہ وہ ''باربی کیو'' کے مزے اڑایا کرتے تھے۔

میں نے اس چھری کی تلاش میں بھی چاروں جانب نظر دوڑائی' جو ماموں کی ملکیت بلکہ اس کی دکان داری کا ایک لازمی جزو بھی تھی اور اسی چھری کی مدد سے ایک اجنبی بدمعاش نے ماموں کو ضرب شدید پہنچائی تھی لیکن مذکورہ چھری مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ اب یہی سوچا اور کہا جاسکتا تھا کہ وہ بندہ ماموں کو زخمی کرنے کے بعد چھری اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

میں نے ریٹائرڈ فوجی فرید بخاری کو دس ایسے افراد اکٹھا کرنے کی ہدایت کی تھی جو حملہ آور اجنبی کو دیکھتے ہی پہچان سکتے ہوں اور اس اللہ کے بندے نے میرے مطلوبہ پندرہ بندے جمع کر لئے تھے۔ جب ماموں اور بدمعاش حملہ آور کے بیچ بحث بازی ہو رہی تھی تو آس پاس کی دکانوں کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ گویا ایسے شاہدین کی کوئی کمی نہیں تھی جو اجنبی حملہ آور کی شناخت میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔

میں نے فرید بخاری کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ ان لوگوں کو لے کر تھانے آ جائیں' پھر میں بتاتا ہوں کہ انہیں کرنا کیا ہے۔''

تھانہ' جائے وقوعہ سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ میں دراصل وہاں سب کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے غلط استعمال سے بعد میں مجھے تفتیشی معاملات میں کسی رکاوٹ یا مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ دوست دشمن تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا تفتیشی معاملات میں بہت زیادہ احتیاط برتنا پڑتی ہے۔

فرید بخاری نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ملک صاحب! جو آپ کا حکم۔ آپ چلیں' ہم بھی آپ کے پیچھے ہی پہنچ رہے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکا' پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑانے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اتنے بندوں کیلئے' ہمیں کم از کم دو تانگے تو کرنا ہی ہوں گے۔''

''آپ جو بھی مناسب سمجھتے ہیں' وہ اقدام ضرور کریں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تو بس' یہ چاہتا ہوں کہ پندرہ بیس منٹ میں آپ لوگ میرے پاس تھانے میں پہنچ جائیں۔''

''پہنچ جائیں گے ملک صاحب۔'' فرید بخاری نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آپ مطمئن ہو کر جائیں۔''

اور میں مطمئن ہو کر صفدر کے ساتھ واپس تھانے آ گیا۔

یہ اطمینان صرف اس حوالے سے تھا کہ ریٹائرڈ فوجی فرید بخاری نے جس کام کا وعدہ کیا تھا وہ ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں اور بہت سارے معاملات نے مجھے اندر سے بے چین کر رکھا تھا۔

میرے لئے سب سے زیادہ تشویشناک امر یہ تھا کہ اس بندے کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ سوہدرہ میں بالکل نیا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا تھا اور کہاں سے وہ آیا تھا؟ اگر وہ کسی کا مہمان تھا تو یہ پتا چلنا بہت ضروری تھا کہ وہ یہاں کے کس رہائشی کے گھر میں مہمان بن کر آیا ہوا تھا۔ قصہ مختصر' جلد از جلد اس بندے کا سراغ لگنا نہایت ہی اہم تھا۔

جب میری نظر میں وہ بندہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ میں اس کا سراغ لگانے کیلئے بے چین ہو رہا تھا تو اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ اگر وہ کسی بری نیت سے قصبہ سوہدرہ میں وارد ہوا تھا تو پھر اسے لازماً یہاں سے جانا بھی تھا۔ لہٰذا ان تمام راستوں کی نگرانی اور ناکہ بندی بھی ضروری تھی جو سوہدرہ میں داخل ہوتے تھے یا یہاں سے باہر جاتے تھے اور اس مقصد کیلئے میرے ذہن میں سب سے اچھی جگہ سوہدرہ کا بس سٹینڈ تھا۔

میرے تھانے سے چند گز کی دوری پر ایک بس سٹینڈ واقع تھا۔ ''سٹینڈ'' کا لفظ اخلاقاً شامل ہو گیا تھا ورنہ وہاں ایسی کوئی بات تھی نہیں۔ بس' بسوں کے رکنے کیلئے ایک جگہ مخصوص تھی۔ اسے آپ چند درختوں کے نیچے واقع ایک سادہ سا دیہاتی بس اڈا سمجھ لیں تو آسانی رہے گی۔ وزیر آباد سے آنے والی بسیں اور ویگنیں وہاں چند منٹ کا پڑاؤ کرتی تھیں' پھر آگے کے گاؤں' دیہات کی سمت بڑھ جاتی تھیں۔ اسی ''بس سٹینڈ'' کے پہلو میں ''تانگا سٹینڈ'' بھی واقع تھا۔

میں نے اس ''مقام'' کی خصوصی نگرانی کا فیصلہ اس لئے بھی کیا تھا کہ سوہدرہ کی جانب آنے والوں اور یہاں سے کہیں اور جانے والوں کو اس بس سٹینڈ یا تانگہ سٹینڈ سے باہر نکلنے

کیلئے یہیں سے گزرنا پڑتا۔ کچھ بھی تھا' اس نامعقول اجنبی لفنگے کی فوری گرفتاری بہت ضروری تھی۔

میں نے تھانے پہنچ کر کانسٹیبل حیدر علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حیدر علی مقامی آدمی تھا اور سوہدرہ کے بچے بچے کو صورت سے پہچانتا تھا۔ اگر اس وقت سوہدرہ کا کوئی وسنیک اس کہانی کو پڑھ رہا ہے تو اسے یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا چاہئے کہ جس دور کی یہ کہانی ہے' اس زمانے میں سوہدرہ اتنا زیادہ پھیلا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا جیسا کہ آج کل نظر آتا ہے۔ اس وقت یہ اونچی سی جگہ پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں بسنے والا ہر شخص گاؤں کے دیگر رہائشیوں کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا۔

حیدر علی نے مجھے سلام کیا اور اٹینشن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کیلئے کہا' پھر نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے حالیہ واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سنتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو اس نے نہایت ہی فرماں برداری سے کہا۔

''ملک صاحب! آپ حکم کریں۔ جو بھی کہیں گے' میں کرنے کو تیار ہوں۔''

حیدر علی ایک چاق و چوبند اور ذہین کانسٹیبل تھا۔ اس کی عمر چھبیس اور ستائیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ مجھے اس کی ذہانت اور پیشہ ورانہ صلاحیت پر پورا بھروسہ تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آج کی رات اور کل کا دن تمہیں اس راستے کی کڑی نگرانی کرنا ہے' جو سوہدرہ سے نکل کر دوسرے مقامات کی طرف جاتا ہے۔ صرف ان لوگوں پر نظر رکھنا ہے جو سوہدرہ کو چھوڑ کر وزیر آباد کی طرف جانے کی کوشش کریں یا دوسری سمت بالائی گاؤں دیہات کا رخ کرنا چاہیں۔ مجھے یقین ہے' وہ اجنبی بدمعاش بھی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔''

''تو اس کا مطلب ہے' اجنبی لوگوں پر ہی خصوصی نظر رکھنا ہوگی؟'' حیدر علی نے کہا۔ ''آپ تو یہ انتظام صرف اس شخص کو گرفتار کرنے کیلئے کر رہے ہیں نا جس نے ماموں تکے والے کو چھری کے وار سے شدید زخمی کر دیا ہے۔''

''تم بالکل صحیح سمجھے ہو حیدر علی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں واقعی اس اجنبی لفنگے کو جتنی جلدی ممکن ہو' اپنی نظر کے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم کیا جا

سکے کہ وہ کون ہے' کہاں سے آیا ہے اور کس مقصد سے آیا ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں آج رات ہی سے اس اجنبی بدمعاش کی تلاش کا کام شروع کر رہا ہوں۔ اگر وہ کسی بری نیت سے سوہدرہ میں موجود ہے تو میری کارروائی کے نتیجے میں وہ بوکھلا جائے گا اور اسی بوکھلاہٹ میں وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ ایسے وقت میں تم اسے قابو کر کے ہتھکڑی پہنا دو گے۔ اس کام کیلئے میں تمہیں دو صحت مند اور مستعد نوجوان بھی دوں گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس کام کو کیسے ہینڈل کرتے ہو۔ بتاؤ' کر لو گے نا؟''

''ملک صاحب! آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے جبھی تو آپ اتنی بڑی ذمہ داری مجھے سونپ رہے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں' میں آپ کا بھروسہ نہیں ٹوٹنے دوں گا۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی حیدر علی۔ تم اس مشن میں ہر قسم کی کارروائی کر سکتے ہو۔ اگر مطلوبہ آدمی کو گرفتار کرنے کیلئے تمہیں کسی مرحلے پر حد سے گزرنا پڑے تو اجازت ہے۔ مجھے ہر قیمت پر وہ بندہ چاہئے۔''

''ٹھیک ہے جناب! میں آپ کی امید پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

''اور تمہیں یہ کام سادہ لباس میں رہتے ہوئے کرنا ہوگا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بس' اب تم روانہ ہو جاؤ۔''

''آپ نے جن دو مستعد نوجوانوں کا ذکر کیا ہے۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ کون لوگ ہیں اور وہ کس طرح میری معاونت کریں گے؟''

''ان دونوں کا تعلق سوہدرہ ہی سے ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم یہاں کے ایک ایک آدمی کو جانتے ہو' انہیں دیکھتے ہی پہچان لو گے۔ میں خود انہیں لے کر تمہارے پاس آؤں گا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ان سے کس طرح کام لینا ہوگا' اس کا فیصلہ تم خود ہی کرو گے۔ وہ مکمل طور پر تمہارے اختیار میں ہوں گے' جیسے چاہو' انہیں استعمال میں لانا۔''

کانسٹیبل حیدر علی نے مجھے سلام کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں جو اتنی شد و مد سے اس اجنبی لفنگے کی تلاش کا پروگرام سیٹ کر رہا تھا' وہ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو بہت عجیب محسوس ہو' لیکن مجھے ہرگز ایسا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اگر کسی ایسے آدمی

لی بات ہوتی جو سوہدرہ کا رہنے والا ہوتو شاید میں ماموں کے ساتھ اس کے تنازع کو اتنی اہمیت نہ دیتا۔ سیدھا سیدھا اسے پکڑ کر تھانے لے آتا' لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

ایک تو اس اجنبی فتنہ پرور شخص کو کوئی جانتا نہیں تھا' دوسرے ماموں کی اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی' تیسرے وہ اس واردات کے بعد اچانک منظر سے غائب ہوگیا تھا...... بس' یہی ایک نکتہ میری تشویش بلکہ میری پریشانی کا سبب تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فرید بخاری اپنی ''ٹیم'' کے ساتھ میرے پاس پہنچ گیا۔ ''ٹیم'' سے میری مراد وہ پندرہ افراد تھے جو حملہ آور اجنبی کو دوبارہ دیکھنے پر بآسانی پہچان سکتے تھے۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔

اتنے زیادہ افراد کو ایک ساتھ بٹھانا تو ممکن نہیں تھا لہٰذا میں نے فرید بخاری کو کرسی پیش کی اور باقی سب کو اپنے سامنے کھڑا کرلیا' پھر میں نے حوالدار جان محمد کو بلا کر ان سب کے نام مع ولدیت کے فہرست تیار کرنے کو کہا۔ ان سب کا تعلق چونکہ موضع سوہدرہ سے تھا لہٰذا ایڈریس وغیرہ نوٹ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ان سب کو تمام حالات و واقعات سے آگاہ کیا' انہیں اپنی سوچ کے بارے میں بتایا' پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''وہ جو کوئی بھی ہے وہ آپ لوگوں کے اندر ہی سوہدرہ میں موجود ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا' لیکن آپ میں سے ہر کوئی اسے دیکھتے ہی پہچان لے گا اور یہی میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اسے ڈھونڈ نکالیں۔ وہ جہاں بھی ملے' اسے پکڑ کر میرے پاس لے آئیں۔ اسے قابو کرنے کیلئے اگر لڑائی جھگڑا اور مار کٹائی بھی کرنا پڑے تو تم لوگوں کو میری طرف سے کھلی چھٹی ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کا امکان موجود ہے اس لئے دھیان رکھنا ضروری ہے اور یہ کہ وہ اجنبی کسی کے گھر آیا ہوا کوئی مہمان بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے اس بات کا تو یقین ہے کہ وہ آپ میں سے کسی کا مہمان نہیں ہوگا' کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو پھر آپ میں سے کوئی نہ کوئی اسے ضرور پہچان لیتا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟''

میرے اس سوال کے جواب میں چاروں جانب سے تائیدی آوازیں ابھریں اور انہوں نے اپنے اپنے انداز میں سر کو اثباتی جنبش بھی دی۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

''لہٰذا اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بندے کو تلاش کرنا ہے۔ یہ گاؤں کوئی زیادہ بڑا نہیں۔ تم لوگ آپس میں سوہدرہ کے مختلف علاقوں کو بانٹ لو اور ابھی سے کام شروع کردو۔ جیسے ہی کوئی اہم بات پتا چلے' فوراً مجھے اطلاع دینا ہے اور اگر وہ مجرم کہیں نظر آجائے تو پہلے اسے قابو کرنا ہے' اس کے بعد میرے پاس آنا ہے۔ ٹھیک ہے......؟''

ایک بار پھر انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''ماموں ٹکا فروش سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی' پھر بھی اس پاگل نے ماموں کو شدید زخمی کردیا۔ اس جنونی سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ کسی اور شخص کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ماموں کی تو جان بچ گئی گاؤں کے کسی اور شخص کو وہ موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے۔ تم لوگوں کی سلامتی اور حفاظت اسی میں ہے کہ اس شخص کو جلد از جلد پکڑنے کی کوشش کرو۔''

وہ سب مجھے یقین دہانی کرانے کے بعد واپسی کیلئے روانہ ہونے لگے تو میں نے ان میں سے دو ہٹے کٹے نوجوانوں کو روک لیا اور باری باری ان کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''تم دونوں کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام اسلم ہے جی۔'' ایک نے بتایا ''محمد اسلم......''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''میں جاوید شاہ ہوں۔''

میرے محتاط اندازے کے مطابق' اسلم نامی نوجوان کی عمر بیس سال کے آس پاس تھی جبکہ جاوید اٹھارہ سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں کی صحت کو قابل رشک کہا جاسکتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی ان کا انتخاب کیا تھا۔

''تم دونوں میں سے کسی کی شادی بھی ہوئی ہے یا ابھی تک کنوارے ہی گھوم پھر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

میں نے یہ سوال ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا' لیکن انہوں نے پتا نہیں' کیا سمجھا کہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''گھبرا کیوں گئے۔ میں تم لوگوں کی شادیاں نہیں کروانے جارہا......!''

انہوں نے یکے بعد دیگرے مجھے بتایا کہ ابھی ان میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی۔ میں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے' پھر تو تمہارے ساتھ بیوی بچوں والا کوئی جھنجٹ نہیں۔ تم ایسا کرو کہ اپنے

گھر بتا کر آ جاؤ کہ آج کی رات تمہاری تھانے میں گزرے گی۔''

''تھانے میں......!'' اسلم نے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

جاوید نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔''جناب! ہم نے کیا جرم کیا ہے......؟''

''ملک صاحب! آپ نے تو ان دونوں جوانوں کو ڈرا ہی دیا ہے۔'' فرید بخاری نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''اب ان کو اصل بات بھی بتا دیں ورنہ یہ بے چارے خوانخواہ پریشان ہوتے رہیں گے۔''

محمد اسلم اور جاوید شاہ کے سوا باقی تیرہ مجرم شناس افراد میرے احکام لینے کے بعد تھانے سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان دونوں جوانوں کو میں نے کسی خاص مقصد کیلئے روکا تھا یا پھر فرید بخاری ابھی تک میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ریٹائرڈ فوجی تھا۔ لہٰذا اپنے تجربے کی بنا پر وہ اتنا تو بھانپ ہی گیا ہوگا کہ میں نے انہیں کسی کام ہی کے سلسلے میں روکا ہے۔ میں نے اسلم اور جاوید کی الجھن دور کرنے کیلئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کسی پریشانی یا وہم میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں' میں تم لوگوں کی کسی خاص جگہ ڈیوٹی لگانا چاہتا ہوں۔''

میں نے سوچ لیا تھا کہ ان دونوں کو میں کانسٹیبل حیدر علی کے ساتھ نتھی کر دوں گا جو تھوڑی دیر پہلے ایک خاص ''مشن'' پر روانہ ہو چکا تھا۔ اسلم اور جاوید بھی چونکہ مقامی تھے لہٰذا ان تینوں کی خوب نبھ جاتی اور میں ان کی جانب سے زیادہ بہتر نتائج کی توقع رکھ سکتا تھا۔

میری وضاحت سن کر ان کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا اور وہ مجھے سلام کر کے خوشی خوشی رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد فرید بخاری نے گھمبیر انداز میں کہا۔

''ملک صاحب! آپ نے ایک بہت اہم نکتہ اٹھایا ہے۔ میں مسلسل اسی بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''کون سا نکتہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہی جناب......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''جس میں آپ نے اس امکان کو ظاہر کیا ہے کہ وہ وحشی انسان کسی کے گھر میں آیا ہوا کوئی مہمان بھی ہو سکتا ہے......!''

''یہ نکتہ میں نے نہیں بلکہ ماموں کی گھر والی غفوری مامی نے اٹھایا ہے بخاری صاحب!'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''جب عباس کلینک میں وہ ماموں کو لینے آئی تھی تو اس

نے اجنبی بدمعاش کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس جانب میری توجہ دلائی تھی......''

میں نے لحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی' پھر اس سے پوچھا۔

''بخاری صاحب! آپ مسلسل اس بارے میں کیوں سوچ رہے ہیں؟''

''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ میرے پڑوس میں ایک شادی ہو رہی ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے مجھے بتانے لگا۔''لڑکی کا نام زرینہ عرف شرمیلی ہے۔ کل چندر کلاں نامی ایک گاؤں سے اس کی برات آنے والی ہے۔''

''لیکن کسی شرمیلی کی شادی کا موجودہ معاملے سے کیا واسطہ ہے؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''واسطہ وہی ہے جناب' جس کی جانب تھوڑی دیر پہلے آپ نے توجہ دلائی ہے۔'' وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔''وہی کہ ماموں پر حملہ کرنے والا اجنبی غنڈہ کسی کا مہمان بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔''آپ کا اشارہ اس امر کی جانب ہے کہ شادی والے گھر میں تو ادھر ادھر سے بہت سارے مہمان آئے ہوئے ہوں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......''

''جی ملک صاحب! آپ میری بات کی تہہ میں اتر گئے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''میں نے اپنے پڑوس میں کئی اجنبی چہروں کو دیکھا ہے جن میں مرد' عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے' یہ تمام لوگ نیاز علی اور رفعت بی بی کے رشتے دار ہوں گے' جو زرینہ کی شادی میں شرکت کی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا تعلق موضع سوہدرہ سے نہیں ہے۔''

زرینہ عرف شرمیلی کے والد کا نام نیاز علی اور والدہ کا نام رفعت بی بی تھا۔ فرید بخاری ہی کی زبانی بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شرمیلی کی عمر لگ بھگ بائیس سال تھی۔ اس سے ایک چھوٹا بھائی الیاس بارہ سال کا تھا۔ یہ کل چار افراد کا خاندان تھا جس میں سے کل ایک فرد یعنی شرمیلی کو یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ موضع چندر کلاں' سوہدرہ سے چار میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اگر سوہدرہ کے اندر کھڑے ہو کر دیکھیں تو یہ گاؤں وزیر آباد کی مخالف سمت میں پڑتا تھا۔ بہر حال' ہر دو صورت میں برات کو اسی مقام سے گزرنا تھا جہاں میں

نے کانسٹیبل حیدرعلی کو تعینات کر دیا تھا۔ شرمیلی کی شادی چندرکلاں کے ایک نوجوان فاروق احمد سے ہورہی تھی' جس کے باپ انوار احمد کا انتقال ہو چکا تھا اور شادی کے تمام تر انتظامات اس کی ماں صادقہ بی بی ہی کر رہی تھی۔

یہ تمام تر معلومات مجھے فرید بخاری کی زبانی حاصل ہوئی تھیں۔ جب اس نے شرمیلی کی شادی اور اس کے گھر میں آنے والے مہمانوں کا تفصیلی ذکر کیا تو میں نے گھمبیر انداز میں کہا۔

''بخاری صاحب! پھر تو آپ کیلئے بھی بہت سا کام نکل آیا ہے......!''

''آپ حکم کریں جی' میں تو ہر خدمت کیلئے تیار ہوں۔'' وہ تعاون آمیز انداز میں بولا۔ ''آرام وسکون کی زندگی گزارتے ہوئے میری ہڈیوں کو پھپھوندی لگ رہی ہے۔ چلیں' اسی بہانے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کا موقع مل جائے گا۔''

''شادی والا گھر آپ کے گھر کے برابر میں واقع ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا وہاں آئے ہوئے مہمانوں پر کڑی نگاہ رکھنا آپ کی ذمہ داری ہوگی۔''

''یہ تو میں کرلوں گا......'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس سے مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔''

''کیا مطلب ہے بخاری صاحب!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ مہمانوں کی نگرانی اس لئے کروانا چاہتے ہیں نا......!'' میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھی سے استفسار کیا۔ ''تاکہ اس آدمی کو قابو کیا جائے' جس نے چھری کا وار کر کے ماموں کو شدید زخمی کر دیا ہے......؟''

''ظاہر ہے......!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''لیکن مسئلہ یہ ہے ملک صاحب کہ میں نے اس خبیث کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے پہچانوں گا کیسے؟''

''اس مسئلے کا بہت ہی آسان حل ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اگر آپ اس شخص کو صورت سے نہیں پہچانتے تو اپنے ساتھ کسی ایسے بندے کو منسلک کرلیں جس نے جائے وقوعہ پر اس بدمعاش کو یہ واردات کرتے دیکھا ہو......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ کوئی مشکل کام ہے؟''

''ہرگز نہیں ملک صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔ میں ایسے بندے کا بندوبست کرلوں گا۔''

ہمارے درمیان مزید پندرہ بیس منٹ تک اسی نامعلوم اجنبی حملہ آور کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی' پھر فرید بخاری مجھ سے بڑا گرمجوش مصافحہ کرنے کے بعد تھانے سے رخصت ہوگیا۔

''ایک اجنبی شخص نے طیش کے عالم میں چھری کا وار کر کے دوسرے شخص کو شدید زخمی کیا اور موقع سے فرار ہوگیا......''

یہ اسٹیٹمنٹ بظاہر بہت معمولی دکھائی دیتا ہے لیکن میرا دل اسے معمولی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ اجنبی لفنگا پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو بات آئی گئی ہوجاتی' مگر اس کی پراسرار گمشدگی ہی میری بے چینی کا اصل سبب تھی۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے ٹھوکا دیتی تھی کہ کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیا گڑبڑ ہے' یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میں انہی پریشان کن سوچوں کے ساتھ چونکھی لڑائی رہا تھا کہ مشتاق احمد اور جاوید شاہ واپس آگئے۔ اب وہ خاصے ہشاش بشاش اور پرسکون دکھائی دیتے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں بتایا کہ میں نے سوہدرہ کی جانب آنے اور یہاں سے باہر جانے والے راستے کے ایک خاص مقام پر ناکہ لگایا ہے جہاں میرے تھانے کا ایک کانسٹیبل حیدرعلی موجود ہے۔ تم دونوں کو اس مشن میں حیدرعلی کی مدد کرنا ہوگی۔

''آپ نے جو کچھ سمجھایا ہے ہم اسی پر عمل کریں گے۔'' جاوید شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''شاباش!'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

میں نے انہیں مزید ضروری ہدایات سے ''لیس'' کیا' پھر اپنی معیت میں وہاں چھوڑ آیا جہاں کانسٹیبل حیدرعلی پہلے سے موجود تھا۔ اس کے بعد میں اپنے کوارٹر میں آگیا۔

جب ماموں کے ''قتل'' کی اطلاع مجھے ملی تھی اس وقت میں تھانے سے اٹھنے کا ارادہ کر چکا تھا اور مجھے بڑی کڑاکے کی بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن اب صورتحال کافی بدل چکی تھی۔ پچھلے تین گھنٹے کی بھاگ دوڑ نے مجھے اس قدر تھکا دیا تھا کہ میری بھوک غائب ہوگئی تھی۔

اصولی طور پر تو اب مجھے اور زیادہ بھوک محسوس ہونا چاہئے تھی لیکن بعض اوقات تمام اصول اور قاعدے قانون دھرے رہ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ تاہم خالی پیٹ سونا بھی عقل مندی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے تھوڑا بہت کھایا' عشاء کی نماز ادا کی اور کوارٹر کے صحن میں چارپائی بچھا کر سونے کیلئے لیٹ گیا۔



اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔

میں ناشتے سے نمٹا ہی تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر تیز دستک کی آواز سنائی دی۔ ذہن فوری طور پر اس اجنبی فتنہ پرور شخص کی طرف چلا گیا جس نے پچھلی رات تیز دھار چھری کا وار کر کے ماموں تکے والے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ ایسا سوچنا ایک فطری عمل بھی تھا۔ تھانے کے عملے کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کتنے بجے اپنے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں لہٰذا کوارٹر کے دروازے پر عام حالات میں اس وقت دستک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

گزشتہ رات میں نے تین چار گھنٹے جس نوعیت کی مصروفیت میں گزارے تھے' انہیں عام حالات یا نارمل سچویشن نہیں کہا جا سکتا تھا چنانچہ اجنبی غنڈے کے حوالے سے کسی اہم اطلاع کی توقع کرنے کا مجھے پورا حق تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں دروازے کی جانب بڑھا کہ یقیناً اسی بندے کے بارے میں کوئی سنسنی خیز خبر ہوگی۔

جب تک میں مختصر سے صحن کو عبور کر کے بیرونی دروازے تک رسائی حاصل کرتا' دستک کی آواز ایک مرتبہ پھر ابھری' جس سے واضح تھا کہ دستک دینے والا کسی اضطراری یا اضطرابی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ بہرحال' میں نے دروازہ کھولا تو خالد بھٹی کی صورت نظر آئی۔

خالد بھٹی ایک کانسٹیبل تھا اور آج کل شبینہ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ رات بھر کا جاگا ہوا ہے۔ میری سوالیہ نظر کے جواب میں وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! آپ فوراً تھانے آ جائیں......!''

''کیا ہو گیا ہے بھئی؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

''بڑا غضب ہو گیا ہے جی۔'' وہ بدستور بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''رفعت بی بی کی لڑکی غائب ہو گئی ہے گھر سے اور...... الزام آ رہا ہے فوجی چاچا پر......''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو خالد......!'' میں نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ ''رفعت کی لڑکی کا فوجی چاچا سے کیا تعلق......؟''

''یہ تو آپ تھانے آ کر خود ہی دیکھ لیں کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق ہے یا نہیں۔'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''دونوں پارٹیاں آئی بیٹھی ہیں کافی دیر سے......''

فوجی چاچا سے اس کی مراد فرید بخاری تھی' کیونکہ سوہدرہ میں اسے بخاری صاحب کے علاوہ ''فوجی چاچا'' بھی کہا جاتا تھا۔ رفعت بی بی کی لڑکی کا مطلب تھا' شرمیلی یعنی زرینہ...... جس کی آج چندر کلاں سے برات آنے والی تھی اور خالد بھٹی مجھے یہ اطلاع دے رہا تھا کہ شرمیلی گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ یہ بڑی خطرناک اور سنسنی خیز اطلاع تھی۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم انہیں بٹھاؤ آرام سے۔ میں دس منٹ میں آتا ہوں۔''

''یس سر!'' یہ کہتے ہوئے خالد بھٹی واپس چلا گیا۔

یہ ایک نیا سلسلہ سامنے آ گیا تھا' جس کے حوالے سے ذہن میں پہلے سے کوئی سوچ تھی ہی نہیں۔ مجھے قوی امید تھی کہ مجھ تک جو بھی پہلی اطلاع پہنچے گی اس کا تعلق اسی نامعلوم شخص سے ہوگا جس نے پچھلی رات ماموں کو شدید زخمی کر دیا تھا۔

وردی پہنتے ہوئے میں اس نئی ہنگامی صورتحال کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ ذہن کے کسی گوشے میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

''شرمیلی کی گمشدگی میں کہیں اسی اجنبی بدمعاش کا ہاتھ تو نہیں؟''

یہ ناممکن نہیں تھا۔ جس نوعیت کے حالات پچھلے بارہ گھنٹے سے دیکھنے میں آ رہے تھے ان کی روشنی میں کچھ بھی بعید نہیں تھا' گویا آج کا دن پھر بھاگ دوڑ اور افراتفری میں گزرنے والا تھا۔

میں برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا تو وہاں نصف درجن افراد کو بیٹھے دیکھ کر چونک گیا۔ ان میں سے صرف ایک چہرہ ایسا تھا جسے میں پہچانتا تھا اور وہ چہرہ تھا ریٹائرڈ فوجی فرید بخاری کا۔ اس کے علاوہ پانچ چھ افراد اور بھی تھے جن میں ایک دو عورتیں بھی شامل تھیں۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک ادھیڑ عمر کی عورت تیزی سے آگے بڑھی۔ انداز ایسا ہی تھا

جیسے وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتی ہو۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

''تھانیدار صاحب! میں تو لٹ گئی۔ میری جوان بچی گھر سے غائب ہوگئی ہے۔ میں دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ تھوڑی دیر بعد تو اس کی برات آنے والی ہے......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے بخاری کی جانب اشارہ کیا' پھر احتجاجی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے پکا شک ہے کہ اسی بندے نے میری شرمیلی کو غائب کروایا ہے......!''

میں نے فریادی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تم رفعت بی بی ہونا؟''

''جی...... میں ہی شرمیلی کی بدنصیب ماں ہوں۔''

پھر میں نے اس کے پیچھے کھڑے مرد کی جانب اشارہ کیا اور رفعت سے سوال کیا۔ ''اور یہ تمہارا گھر والا نیاز علی ہے؟''

''نہیں جی' یہ تو میرا دیور افتخار علی ہے۔'' رفعت نے جواب دیا۔ ''نیاز علی کا چھوٹا بھائی۔ نیاز علی تو شرمیلی کی خبر سن کر گر گیا تھا۔ اسے اتنی زور کا چکر آیا کہ دھڑام سے زمین پر گرا اور اس کے سر میں شدید چوٹ آئی ہے۔ اس لئے میں نیاز علی کو گھر میں چھوڑ آئی ہوں اور......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک عورت کی جانب انگلی اٹھائی اور بتایا۔

''یہ میری چھوٹی بہن نگہت ہے اور باقی بھی ہمارے مہمان ہیں۔''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ان نصف درجن افراد میں زیادہ تر رفعت بی بی ہی کے حمایتی تھے۔ فرید بخاری بے چارہ اکیلا ہی نظر آتا تھا۔

برآمدے میں کھڑے کھڑے کچہری لگانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا میں نے رفعت بی بی سے کہا۔ ''تم میرے کمرے میں آکر اپنا بیان لکھواؤ۔'' اور باقی لوگوں پر میں نے واضح کردیا۔

''تم میں سے کوئی ایک فرد رفعت کے ساتھ میرے کمرے میں آسکتا ہے۔ وہاں میلہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

بات ختم کرتے ہی میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد رفعت بی بی اور افتخار علی میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے

رفعت بی بی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''دیکھو بی بی! مجھے تمہاری بچی کی گمشدگی کا سخت افسوس ہے۔ میں اسے جلد از جلد بازیاب کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اس مقصد میں کامیابی کیلئے مجھے تمہارے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کیلئے تیار ہوں جی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''بتائیں' مجھے کیا کرنا ہوگا......؟''

''سب سے پہلے تو تم مجھے اس واقعہ کی تفصیل بتاؤ!''

''اچھا جی! بتاتی ہوں......'' یہ کہہ کر وہ شروع ہوگئی۔

رفعت بی بی کے بیان کے مطابق گزشتہ رات گھر میں شادی کا ہنگامہ چل رہا تھا۔ خوب گہما گہمی تھی۔ گھر عزیز رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ آدھی رات سے کچھ دیر پہلے سب لوگ سو گئے' پھر آج صبح جب گھر کے لوگ بیدار ہوئے تو شرمیلی غائب تھی۔ شرمیلی کو گھر میں نہ پاکر ایک قیامت سی جاگ اٹھی۔ یہ انہونی سب کیلئے پریشانی کا باعث تھی۔ آج دن میں زرینہ عرف شرمیلی کی برات آنے والی تھی اور وہ غائب ہوگئی تھی۔ رفعت بی بی کی پریشانی یہ تھی کہ وہ لوگوں کو اور خصوصاً براتیوں کو کیا جواب دے گی۔ اس کی تکلیف اپنی جگہ درست تھی لیکن اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے ذہن کو الجھا رہی تھیں۔ لہٰذا وہ جیسے ہی اپنا بیان مکمل کرکے خاموش ہوئی' میں نے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کردیا۔

''کیا رات کو شرمیلی اکیلی سوئی تھی یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

''اس کے ساتھ اس کی سہیلی تھی۔'' رفعت نے جواب دیا۔ ''شاہدہ نام ہے اس کا۔''

''شاہدہ اور شرمیلی کسی کمرے میں سوئی تھیں یا......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو رفعت جلدی سے بولی۔ ''جی' وہ دونوں اندرونی کمرے میں سوئی تھیں۔ باقی سب لوگ دوسرے کمروں میں اور صحن میں سوئے ہوئے تھے۔''

''آج صبح جب تم لوگ جاگے تو شرمیلی اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سب سے پہلے گھر کے کس فرد کو پتا چلا تھا کہ شرمیلی غائب ہوچکی ہے؟''

''شاہدہ ہی نے یہ اندوہناک خبر سب کو دی تھی۔'' افتخار علی نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بتایا۔''اس وقت تک گھر کے بیشتر لوگ بیدار ہو چکے تھے۔ اِکا دُکا بس سو رہے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی گھر میں ایک ہنگامہ جاگ اٹھا۔ پہلے شرمیلی کو ادھر ادھر تلاش کیا گیا۔ جب وہ کہیں نہ ملی تو ہم نے تھانے کا رخ کیا ہے جناب اور اب ہم آپ کے سامنے بیٹھے ہیں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی' پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! جو باہر ریٹائرڈ فوجی بیٹھا ہوا ہے نا...... مجھے تو پورا شک ہے کہ شرمیلی کو اسی نے غائب کیا ہے۔''

''جی ہاں......'' رفعت نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔''مجھے بھی اس پھجل پر شک ہے جناب......!''

''آپ لوگ کس بنا پر فرید بخاری کو شرمیلی کی گمشدگی کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں؟'' میں نے رفعت کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔''وہ تو برسوں سے آپ کا پڑوسی ہے۔ اس کی شرمیلی سے یا آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے......؟''

''میں مانتی ہوں کہ ہم لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی ہے' دشمنی کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن......!''

''لیکن کیا رفعت بی بی......؟'' وہ ذرا سا اٹکی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

''بخاری صاحب نے کل رات کو جو ڈرامہ کیا ہے وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔'' رفعت نے ''لیکن'' کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔''اسی وجہ سے میرا دھیان اس کی طرف جا رہا ہے۔ ایسا رویہ اس نے یا اس کے گھر والوں نے پہلے کبھی نہیں دکھایا تھا۔ میں تو حیران ہوں کہ رات کو اسے ہو کیا گیا تھا......؟''

''تھانیدار صاحب!'' افتخار علی اپنی بھابی کی تائید میں بولا۔''رفعت بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے خود بھی اس بخاری کی حرکت بہت ناگوار گزری تھی۔''

''دیکھیں جی' اگر کسی آوارہ شخص نے ماموں تکے والے کو چھری مار کر زخمی کر دیا ہے تو اس میں ہمارا اور ہمارے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کا کیا قصور ہے۔'' رفعت بی بی نے برہمی سے کہا۔

یہ اس کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے تھانیدار صاحب!'' افتخار علی نے خفگی آمیز انداز میں

کہا۔''وہ اس بہانے گھر کے اندرونی ماحول کا جائزہ لے رہا تھا تا کہ اسے اپنے کام میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ میں تو کہتا ہوں جناب......'' اس نے رازدارانہ انداز میں توقف کیا' پھر دھیمی آواز میں بولا۔

''میں تو کہتا ہوں جناب کہ آپ اس فوجی چاچا کو زیر تفتیش لا کر اس سے کڑی پوچھ گچھ کریں تو شرمیلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔''

''ضرور...... ضرور...... کیوں نہیں!'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔''شرمیلی کی گمشدگی کے حوالے سے آپ لوگ جس پر بھی اپنا شک ظاہر کریں گے' میں اس سے کڑی تفتیش کروں گا۔'' میں نے تھوڑی دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ صرف مجھے اتنا بتا دیں کہ رات فوجی چاچا نے آپ کے گھر میں کس قسم کی سرگرمی دکھائی تھی......؟''

ان دونوں نے مل جل کر مجھے جو واقعہ سنایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ ریٹائرڈ فوجی فرید بخاری' گاؤں ہی کے ایک بندے کے ساتھ خفیہ نوعیت کی تفتیش کرتا پھر رہا تھا۔ اسے کسی ایسے اجنبی شخص کی تلاش تھی جو ماموں تکے والے کو شدید زخمی کر کے کہیں غاب ہو گیا تھا۔ فوجی چاچا کو یقین تھا کہ مذکورہ شخص سوہدرہ کا وسینک نہیں' لہٰذا وہ کسی کے گھر آیا ہوا مہمان بھی ہو سکتا ہے۔ اس رات سب سے زیادہ مہمان چونکہ شادی والے گھر میں موجود تھے اور یہ گھر فوجی چاچا کا پڑوس بھی تھا لہٰذا اس کی تفتیش کا مرکز بھی یہی گھر بنا رہا۔ اگر اس پوچھ گچھ کا دائرہ رفعت کے گھر سے باہر ہی رہتا تو انہیں فرید بخاری کی یہ حرکت شاید اتنی ناگوار نہ گزرتی لیکن جب اس نے تفتیش کے بہانے گھر کے اندر بھی جھانکنا شروع کیا تو گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ بہرحال رفعت وغیرہ نے ایک دیرینہ پڑوسی ہونے کے ناتے اس کے کام میں مداخلت نہیں کی' لیکن جب آج صبح زرینہ عرف شرمیلی اپنے کمرے سے غائب پائی گئی تو سب کا دھیان فوراً فوجی چاچا اور اس کی رات والی کارروائی کی طرف چلا گیا اور اب یہ فساد رفعت کے گھر سے سفر کرتے ہوئے تھانے تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے بڑی توجہ سے ان دونوں کی بات سنی اور فوراً یہ بھی محسوس کر لیا کہ رفعت بی بی کے دل میں تو فوجی چاچا کیلئے مخالفانہ جذبات اتنے زیادہ نہیں تھے لیکن افتخار علی کے بھڑکانے

نے اسے خاصا گرم کر دیا تھا۔ وہ اپنی کم اور دیور کی زبان زیادہ بول رہی تھی۔ افتخار کے انداز ے یہی جھلکتا تھا کہ اسے ایک سو ایک فیصد یقین ہے' شرمیلی کی گمشدگی میں فوجی چاچا کے سوا اور کسی کا ہاتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال' وہ لوگ ایک فریاد لے کر میرے پاس آئے تھے لہٰذا میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آپ لوگ مطمئن ہو کر گھر جائیں' تھوڑی دیر میں' میں بھی پہنچ رہا ہوں' ضروری کارروائی کیلئے۔ ان شاء اللہ! میں جلد از جلد شرمیلی کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔''

''اور اس مچھل فوجی چاچا کا آپ کیا کریں گے!'' افتخار علی نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''جو ہمارے پیچھے ہی تھانے پہنچا ہے اور اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے؟''

''اس کے خلاف میں نے آپ کی شکایت سن لی ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ لوگوں کے جانے کے بعد میں فرید بخاری سے کڑی پوچھ گچھ کروں گا۔ اگر وہ اس معاملے میں ملوث پایا گیا تو اطمینان رکھیں' وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔''

''مجھے تو میری بچی واپس مل جائے' بس......'' رفعت بی بی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''مجھے کورٹ کچہری اور مقدمے بازی کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''بھابی! آپ زیادہ پریشان نہ ہو......'' افتخار علی نے رفعت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تھانیدار صاحب بہت جلد شرمیلی کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اگر وہ مچھل ہماری بچی کی گمشدگی میں ملوث ہے تو پھر تھانہ کچہری بھی ہوگا اور اس بدمعاش کو سخت سزا بھی ملے گی۔''

''شرمیلی برات آنے سے پہلے مل جائے گی ناں تھانیدار صاحب......؟'' وہ حسرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میری ناک نہیں کٹنا چاہئے جناب!''

''رفعت بی بی! میری کوشش تو یہی ہے کہ تمہاری بیٹی جلد از جلد بازیاب ہوجائے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آگے اللہ کی جو مرضی۔ تم بھی شرمیلی کے ملنے کیلئے دعا کرو۔''

تھوڑی دیر بعد میں نے رفعت بی بی کو تسلی تشفی دے کر اس کے دیور کے ساتھ روانہ کر دیا اور فرید بخاری المعروف بہ مچھل فوجی چاچا کو اپنے پاس بلالیا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھنے کے بعد تازہ ترین صورتحال کی وضاحت کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے جلدی سے کہا۔

''بخاری صاحب! آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے یقینا اس بات کا اندازہ ہے کہ رفعت بی بی کی گمشدہ لڑکی والے معاملے میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں۔

آپ نے جس کھلے ڈلے انداز میں اس اجنبی بدمعاش کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اسی نے ان لوگوں کو آپ پر شک ظاہر کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔''

''مجھے اپنے نشانہ بننے یا موردالزام ٹھہرائے جانے کی ذرا بھی پروا نہیں ملک صاحب! کیونکہ میں جانتا ہوں' شرمیلی کی گمشدگی سے میرا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''رفعت کے گھر میں شادی کی وجہ سے اتنے زیادہ لوگ جمع تھے کہ میں گھر میں داخل ہوئے بغیر فرداً فرداً ان کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا لہٰذا مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے' وہ قانون کی مدد کرنے کیلئے کیا ہے لیکن افسوس کہ ہمارا مطلوبہ بندہ تو نہ مل سکا اور یہ ایک نیا پھڈا اٹھ کھڑا ہوا......!''

''یہ ایک حقیقت ہے کہ ماموں کو زخمی کر کے فرار ہونے والے شخص کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا اور یہ بھی ایک ٹھوس سچائی ہے کہ شرمیلی اپنے گھر سے غائب ہو چکی ہے۔'' میں نے بخاری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تجزیاتی انداز میں کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق وہ بندہ ابھی تک سوہدرہ کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔ اگر وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا تو میرے عملے کی نظر سے بچ نہیں سکتا تھا اور یہی بات میں زرینہ عرف شرمیلی کیلئے بھی کہوں گا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے معنی خیز نظر سے بخاری کو دیکھا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے گھر سے غائب ہو چکی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے یا کوئی زبردستی اسے اٹھا کر لے گیا ہے' اس بات کا فیصلہ بعد میں کیا جا سکتا ہے' سردست میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی ابھی تک موضع سوہدرہ کے اندر ہی کہیں موجود ہے۔ وہ بھی اگر سوہدرہ کو چھوڑنے کا ارادہ کرتی تو بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے رات ہی میں نگرانی کا ایسا بندوبست کر دیا تھا کہ سوہدرہ سے باہر جانے والا کوئی شخص قانون کی نظر میں آئے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔''

''ملک صاحب......! وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کہیں شرمیلی کی گمشدگی میں بھی اسی بدمعاش کا ہاتھ تو نہیں' جس نے رات ماموں کو شدید زخمی کر دیا تھا؟''

''ایسا ہو سکتا ہے اور آپ کی طرح میرا ذہن بھی اسی انداز میں سوچ چکا ہے......'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں گھر گھس کر تلاشی لینا ہوگی' پھر ہی بات

بن سکے گی۔''

''آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ پرخیال انداز میں بولا۔ ''لیکن میرا دھیان کسی اور طرف بھی جا رہا ہے۔''

''کس طرف؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر ہم فرض کرلیں اور جیسا کہ موجودہ حالات بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ماموں کو شدید زخمی کرنے والا وہ لفنگا ہی شرمیلی کی گمشدگی کا ذمہ دار ہے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ یہ کام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ شرمیلی اپنی مرضی سے غائب ہوئی ہے اور وہ بھی اپنی رخصتی سے ایک رات پہلے۔ مجھے تو یہ کوئی عاشقی معشوقی کا چکر نظر آرہا ہے جناب!'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اگر شرمیلی کو زبردستی اغوا کیا جاتا تو شادی والے گھر میں کوئی نہ کوئی افراتفری تو یقیناً پھیلنا چاہئے تھی نا...... رات کو سب ٹھیک ٹھاک سوئے اور صبح پتا چلا کہ دلہن ہی گھر میں موجود نہیں یا تو شرمیلی خود اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے جناب اور یا پھر گھر کے کسی فرد نے اس سلسلے میں اس کی معاونت کی ہے۔ یہ اغوا کا معاملہ ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا!''

''بخاری صاحب! میں آپ کے تجزیے سے کافی حد تک اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے ذہن نے فوری طور پر جو لائحہ عمل ترتیب دیا ہے اس کی روشنی میں ہمیں دو محاذوں پر نبرد آزما ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک محاذ میرا ہے اور دوسرا آپ کا۔''

''یہاں تک تو سمجھ گیا ہوں جناب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آگے فرمائیں۔''

میں نے فرمایا۔ ''آپ نے مجھے کل پندرہ بندے فراہم کئے تھے جن میں سے دو' اسلم اور جاوید کو میں نے اپنے ایک کانسٹیبل کے ساتھ لگا رکھا ہے۔ باقی تیرہ کی مدد سے آپ سوہدرہ کے چاروں جانب ایک گھیرا سا بنالیں گے تاکہ شرمیلی اور مطلوبہ بدمعاش میں سے کوئی یا وہ دونوں ایک ساتھ کہیں جانے کی کوشش کریں تو آپ لوگ انہیں فوراً قابو کرلیں۔ اب ہمیں ان خطوط پر بھی سوچنا ہے کہ وہ دونوں ساتھ ہیں......'' میں نے اتنا کہہ کر تھوڑا توقف کیا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''آپ چونکہ شرمیلی کے پڑوسی بھی ہیں اور آپ نے کسی عاشقی معشوقی والے معاملے کی بھی نشاندہی کی ہے اس لئے اس معاملے کی جڑ کھودنا بھی آپ ہی کے فرائض کا حصہ ہے۔ آپ اپنے گھر کی خواتین سے مدد لیں اور جلد از جلد یہ پتا چلانے کی کوشش کریں کہ شرمیلی اس شادی پر راضی بھی تھی یا اس کے گھر والے زبردستی بیاہ رہے تھے اور...... اگر وہ واقعی فاروق نامی' چندر کلاں کے اس جوان سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی تو پھر اس کا رجحان کس طرف تھا...... آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ 'یہ کام میں کرلوں گا۔ اب ذرا آپ اپنے مشن کے بارے میں بھی تو بتائیں؟''

''میں اپنے عملے کے دو تین افراد کے ساتھ فوراً رفعت بی بی کے گھر جا رہا ہوں۔'' میں نے بخاری کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سب سے پہلے تو جائے وقوعہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں شاہدہ نامی اس لڑکی کا کڑا انٹرویو بھی اہم ثابت ہوگا جو شرمیلی والے کمرے میں سوئی ہوئی تھی......'' میں نے ذرا دیر کو رک کر سانس درست کی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد ہم خانہ تلاشی کا سلسلہ شروع کریں گے۔ میری خواہش اور کوشش تو یہی ہے کہ شرمیلی کی برات کی آمد سے پہلے ہی اسے برآمد کرلوں۔''

''بشرطیکہ...... وہ ابھی تک گاؤں کے اندر موجود ہو......!'' بخاری نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا اور مجھے سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

فرید بخاری عرف فوجی چاچا کا آخری جملہ بڑا پرمعنی اور فکر انگیز تھا' لیکن پتا نہیں کیوں' میرے اندر سے ایک صدا ابھر رہی تھی کہ زرینہ عرف شرمیلی سوہدرہ ہی میں سے ملے گی۔ یہ چھٹی حس کا اشارہ بھی ہوسکتا تھا' کیونکہ زرینہ عرف شرمیلی آدھی رات کے بعد ہی گھر سے نکلی تھی اور میں اس سے بہت پہلے موضع سوہدرہ کی ناکہ بندی کا تسلی بخش بندوبست کرچکا تھا۔

شرمیلی اپنی شادی سے ایک رات پہلے گھر سے غائب ہوگئی تھی تو اس کا صاف صاف مطلب یہی تھا کہ وہ اس شادی کیلئے راضی نہیں تھی۔ صحیح صورتحال کا اندازہ جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد ہی لگایا جاسکتا تھا۔

ماموں والے واقعہ میں جن افراد نے حملہ آور کو بہت قریب سے دیکھا تھا ان کے

مطابق اس کا حلیہ کچھ اس طرح کا تھا۔ عمر تیس سال کے آس پاس، رنگ گورا، قد درمیانہ، جسم مائل بہ فربہی، ہلکی ہلکی اور باریک سی مونچھیں، دائیں آنکھ کے اوپری حصے میں کسی پرانے زخم کا لگ بھگ دو انچ لمبا نشان جیسے کبھی کسی تیز دھار آلے سے اس پر وار کیا گیا ہو۔ علاوہ ازیں اس کی آنکھوں میں سرخی بھی تیرتی بتائی گئی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط، ایک غصیلا شخص تھا۔

یہ ایک ایسا حلیہ تھا جو سنتے ہی مجھے ذہن نشین ہوگیا تھا۔ اگر وہ شخص اچانک میرے سامنے آجاتا تو میں اسے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہ کرتا۔ ایک لحاظ سے یہ بڑا عجیب و غریب کیس تھا۔



شادی والا گھر ماتم کدے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

میں لگ بھگ نو بجے شرمیلی کے گھر میں موجود تھا اور دلچسپ بلکہ افسوسناک بات یہ تھی کہ وہ گزشتہ رات ہی یہاں سے کہیں اور منتقل ہو چکی تھی۔ آج دن میں ہی کسی بھی وقت اس کی برات آنے والی تھی۔ چندر کلاں کا ایک نوجوان فاروق احمد، شرمیلی کو بیاہ کر اپنے ساتھ لے جانے والا تھا اور وہ اپنی رخصتی سے پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی۔ کہاں......؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اپریل کا وسط گرمی کے لحاظ سے کچھ کم ظالم نہیں ہوتا۔ آج کل جون اور جولائی والی قیامت خیزی تو نہیں تھی، پھر بھی لگ پتا رہا تھا۔ ابھی صبح کے نو ہی بجے تھے اور سورج نے اپنا دیدار ایسے جلالی انداز میں کرایا تھا کہ جسم کا ایک ایک مسام پسینہ اگلنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

رفعت بی بی اینڈ کمپنی کا گھر چار بڑے کمروں اور ایک کشادہ صحن پر مشتمل تھا۔ دو بڑے کمرے گھر کے پچھلے حصے میں پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے برآمدہ اور پھر سامنے صحن پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح گھر کے سامنے والے حصے میں بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے جنہیں پہلو بہ پہلو نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ ان دونوں کے بیچ میں گھر کا داخلی دروازہ واقع تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ چند پھل دار اور پھول دار پودے لگے ہوئے تھے اور دوسری دیوار کے ساتھ ایک قطار میں باتھ روم اور باورچی خانہ تعمیر کیا گیا تھا۔ یہیں پر ایک کونے سے زینہ شروع ہوتا تھا جو باورچی خانے کی چھت کے اوپر سے ہوتے ہوئے کمروں کی چھت تک پہنچتا تھا۔ یہ تمام تر معلومات مجھے گھر کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد پتا چلی تھی۔

رفعت بی بی کے دیور افتخار علی نے گھر کے دروازے پر ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اندر بیٹھک میں لے گیا۔ یہ سامنے والے دو کمروں میں سے ایک تھا۔ رفعت بی بی بھی فوراً میرے

پاس آ گئی اور ایک مرتبہ پھر روہانسے انداز میں مجھ سے التماس کرنے لگی کہ میں جلد از جلد اس کی بیٹی زرینہ عرف شرمیلی کو ڈھونڈ نکالوں۔ میں نے اس کی دکھ درد بھری باتیں سماعت لیں' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے کسی بھی قسم کی کارروائی کا آغاز کرنے کیلئے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے بغیر میں شرمیلی کی تلاش میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکوں گا۔''

''جی بتائیں......کون سی دو چیزیں؟'' رفعت نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ایک تو میں شرمیلی کی سہیلی شاہدہ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جو پچھلی رات شرمیلی کے ساتھ کسی کمرے میں سوئی تھی اور دوسرے مجھے وہ کمرہ بھی دکھا دو جہاں سے شرمیلی غائب ہوئی ہے......؟''

''شاہدہ تو تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے گھر گئی ہے جی!'' رفعت نے بتایا۔ ''میں ابھی کسی کو بھیج کر اسے بلا لیتی ہوں اور آپ آئیں میرے ساتھ' میں آپ کو شرمیلی والے کمرے میں لے چلتی ہوں۔''

''کیا شاہدہ کہیں قریب ہی رہتی ہے؟'' میں نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی......ساتھ والے گھر میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک طرف شاہدہ کا گھر ہے اور دوسری جانب اس مچھل فوجی چاچا کا جو پچھلی رات تھانیدار بن کر ہمارے گھر میں کسی اجنبی بدمعاش کو ڈھونڈ رہا تھا۔''

میں نے رفعت کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے گلی میں کھڑے ہو کر مکانوں کی قطار کا ایک سرسری سا جائزہ لیا تھا۔ بخاری کے حوالے سے جس سمت رفعت نے اشارہ کیا تھا' وہ گلی کا پہلا مکان تھا۔ اس کے ساتھ رفعت بی بی کا گھر تھا اور پھر لگ بھگ بارہ چودہ مکان اور تھے گلی میں۔

میں نے رفعت بی بی کی معیت میں قدم بڑھانے سے پہلے' ساتھ آئے ہوئے دونوں کانسٹیبلوں کو اشارے سے اپنے پاس آنے کو کہا' پھر انہیں کمرے کے کونے میں لے جا کر دھیمے لہجے میں ضروری ہدایات دینے لگا۔ انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور اثبات میں گردنیں ہلاتے ہوئے رفعت بی بی کے گھر سے باہر نکل گئے۔

میں نے انہیں اس گلی کے دونوں کونے سنبھالنے کی تاکید کی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ

احکام بھی دیئے تھے کہ وہ ایک ایک دروازے پر نظر رکھیں اور کسی بھی قسم کی غیر معمولی بات دیکھیں تو فوراً حرکت میں آ جائیں۔ وہ میرے مقصد کی تہ میں اتر کر احکام کی تعمیل کیلئے فوراً روانہ ہو گئے تھے۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا اور وہ یہ کہ تھانے سے روانہ ہوتے وقت میں نے تین افراد کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ان میں دو تو یہی کانسٹیبلز تھے' تجمل حسین اور صفدر علی اور...... تیسرا شخص تھا محمد بوٹا!

محمد بوٹا کا شمار ''ساٹھا پاٹھا'' مردوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ شخص تھا۔ اس کی پیشہ ورانہ مہارت کا میں دل و جان سے قائل تھا اور گاہے بگاہے ضرورت پڑنے پر میں اس کی خدمات حاصل کرتا رہتا تھا۔ جی ہاں...... محمد بوٹا ایک مانا ہوا ماہر کھوجی تھا۔

صفدر اور تجمل باہر چلے گئے تو میں نے رفعت کو چلنے کا اشارہ کیا۔ افتخار علی بھی میرے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جب ہم لوگ بیٹھک سے نکل کر گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو افتخار علی نے رفعت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بھابی! آپ تھانیدار صاحب کو شرمیلی والا کمرہ دکھاؤ' میں شاہدہ کو بلانے کسی کو اس کے گھر بھیجتا ہوں۔''

'ٹھیک ہے......'' رفعت اثبات میں گردن ہلا کر آگے بڑھ گئی۔

وہ چار بڑے کمروں اور ایک کشادہ صحن والا گھر تھا' لیکن ان دنوں چونکہ وہ شادی والا گھر تھا اس لئے مہمانوں کی موجودگی کے باعث بقول شخصے' کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں رفعت بی بی کی رہنمائی میں گھر کے عقبی کمروں میں سے ایک کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے تھانے میں ہی رفعت اور افتخار کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس کمرے کو لاک کر دیا جائے جہاں رات کو شرمیلی سوئی تھی۔ انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ ابھی رفعت نے میرے سامنے ہی کمرے کا تالا کھولا تھا۔

میں محمد بوٹا کے ساتھ مذکورہ کمرے میں داخل ہوا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بوٹا جی! وہ لڑکی جس کا کھرا نکالنا ہے وہ پچھلی رات اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس کمرے میں سوئی تھی۔ میں نے اس کی سہیلی کو بلا لیا ہے۔ آپ کام شروع کریں۔''

میرا اشارہ پا کر محمد بوٹا اکڑوں زمین پر بیٹھ گیا اور کمرے کے فرش کو عقابی نظر سے گھورنے لگا۔ اس دوران میں‘ میں رفعت بی بی سے محوِ گفتگو رہا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”رفعت بی بی! آج صبح سب سے پہلے کس کو پتا چلا تھا کہ شرمیلی گھر سے غائب ہے؟“

”یہ اطلاع تو شاہدہ ہی نے دی تھی۔“ رفعت نے بتایا۔ ”وہ کمرے سے باہر نکلی اور یہ خبر سنائی کہ شرمیلی کمرے میں موجود نہیں......!“

”پھر آپ لوگوں نے کیا‘ کیا تھا؟“

”یہ خبر سنتے ہی ہم پریشان ہو گئے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم نے شرمیلی کو پورے گھر میں تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی نہ ملی تو آس پڑوس کے گھروں سے بھی پوچھ کر دیکھ لیا مگر......“

وہ ٹوٹے ہوئے انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”رات کو شرمیلی اور شاہدہ نے کمرے کے دروازے کو بند کر لیا تھا یا کھلے ہوئے دروازے کے ساتھ ہی سوئی تھیں؟“

”انہوں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔“ رفعت نے جواب دیا۔ ”لیکن نہ تو بند کیا تھا اور نہ ہی اندر سے کنڈی لگائی تھی۔“

”جب تمہیں پتا چلا کہ شرمیلی گھر سے غائب ہو چکی ہے تو اس وقت تمہارا بیرونی دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا؟“ میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

”میں اس وقت گھر کے صحن میں کھڑی تھی جب شاہدہ نے کمرے سے نکل کر مجھے یہ بری خبر سنائی تھی......“ رفعت بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”اور یہ منحوس خبر سنتے ہی میرا دھیان آپوں آپ باہر والے دروازے کی طرف گیا تھا اور میں نے دیکھا‘ دروازہ بند تھا۔“

”دروازہ بند تھا مطلب...... محض بھڑا ہوا تھا یا اندر سے کنڈی بھی لگی ہوئی تھی؟“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”جی دروازے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی......!“

رفعت بی بی کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ گھر کے داخلی دروازے کو اندر سے کنڈی لگے ہونے کا مطلب یہ تھا کہ شرمیلی اس دروازے کے راستے گھر سے باہر نہیں نکلی تھی یا پھر

گھر کے کسی فرد کی مدد سے وہ غائب ہوئی تھی‘ جس نے اس کے جانے کے بعد بیرونی دروازے کی پھر سے کنڈی بند کر دی تھی اور...... یہ کام شاہدہ کا بھی ہو سکتا تھا۔

آخری جملہ میرے ذہن کی پیداوار تھا اور اس کے اندر بے پناہ سنسنی بھری ہوئی تھی۔ شاہدہ‘ شرمیلی کی رازدار سہیلی تھی۔ اگر شرمیلی نے گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا تو عین ممکن تھا‘ اس نے اپنی رازدار سہیلی کو بھی اپنے منصوبے سے آگاہ کر رکھا ہو تاکہ اس کی مدد سے اپنے منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کر سکے۔

اس سے پہلے کہ میں رفعت بی بی سے مزید کوئی سوال پوچھتا‘ افتخار علی‘ شاہدہ کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے لامحالہ شاہدہ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ میں نے کھوجی بابا محمد بوٹا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”بوٹا جی! یہ ہے گمشدہ دلہن کی سہیلی شاہدہ جو پچھلی رات اس کمرے میں موجود تھی۔ آپ ذرا اس کے پاؤں کا کھرا ابھی چیک کر لو۔“

”اس بچی کا کھرا تو میں چیک کر لیتا ہوں کیونکہ یہ میرے سامنے موجود ہے۔“ محمد بوٹا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس لڑکی کی کوئی چپل یا جوتی چاہئے جسے تلاش کرنا ہے......“ وہ لمحاتی توقف کر کے کھانسا‘ پھر سرسری انداز میں بولا۔

”میں نے اس کمرے میں لگ بھگ دس افراد کے کھرے الگ الگ پہچان لئے ہیں۔ اب یہ پتا چلانا ہے کہ غائب ہونے والی دلہن کا کھرا ان میں سے کون سا ہے......!“ پھر وہ شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”دلہن رات کو کس بستر پر سوئی تھی؟“

اس کمرے میں دو چارپائیاں پہلو بہ پہلو بچھی ہوئی تھیں‘ جن پر بستر بھی لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ظاہر ہے‘ ان میں سے ایک چارپائی پر شرمیلی اور دوسری پر شاہدہ سوئی ہو گی۔

شاہدہ نے دیوار کی جانب والی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”جی‘ شرمیلی رات کو اس چارپائی پر سوئی تھی۔“

”ہوں......!“ محمد بوٹا معنی خیز انداز میں ہنکارا بھر کر ایک مرتبہ پھر زمین کا جائزہ لینے لگا‘ پھر سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”لائیں جی دلہن کے پاؤں کی کوئی جوتی......!“

رفعت نے فوراً محمد بوٹا کی ”فرمائش“ پوری کر دی۔ میں نے شاہدہ کو محمد بوٹا کے حوالے

کرتے ہوئے کہا۔

''بوٹا جی! آپ اس کمرے میں کھرے وغیرہ کی تحقیق مکمل کرلو۔ اتنی دیر میں' میں رفعت بی بی سے چند باتیں کرلیتا ہوں۔''

اس نے سرسری انداز میں سر ہلایا اور اپنے کام میں جت گیا۔

میں رفعت بی بی کو لے کر واپس بیٹھک میں آ گیا۔ افتخار علی سایہ بن کر ہمارے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر آ جا رہا تھا چنانچہ وہ بھی ہمارے پیچھے ہی وہاں پہنچ گیا۔ بیٹھک میں اس وقت ہم تینوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سنجیدہ نظر سے باری باری ان دونوں کو دیکھا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''رفعت بی بی! شرمیلی کے باپ کو بھی یہاں بلالو۔ میں بہت ہی اہم بات کرنے والا ہوں...... نیاز علی ابھی تک مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ ہے کہاں؟''

''تھانیدار صاحب! آپ کی آمد سے چند منٹ پہلے ہی تو میں نے بھائی صاحب کو ایک بندے کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک بھیجا ہے۔'' افتخار علی جلدی سے بولا۔ ''شرمیلی کی گمشدگی سے وہ ڈھے گئے ہیں۔ میں تو ڈاکٹر کو گھر پر بلانا چاہتا تھا لیکن بھائی جی ہی نہیں مانے۔''

''آپ کو جو بھی کہنا ہے' ہم سے کہہ لیں۔'' رفعت جلدی سے بولی۔

''ٹھیک ہے!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں آپ لوگوں سے جو دو تین سوالات پوچھنے والا ہوں...... ان کا سچا اور کھرا جواب دینا ہے ورنہ بڑی گڑبڑ ہوجائے گی کیونکہ......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا' پھر ڈرامائی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ میں اس بارے میں کافی کچھ جانتا ہوں۔''

یہ آخری جملہ میری طرف سے ایک نفسیاتی چال تھی' حالانکہ میں کسی بھی حوالے سے قطعاً کچھ نہیں جانتا تھا۔

وہ دونوں تشویش بھری نظروں سے مجھے تکنے لگے' پھر افتخار علی نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''ایسی کیا...... بات ہے...... تھانیدار جی......؟''

''کیا شرمیلی اس شادی کیلئے دل سے راضی تھی؟''

میرے سوال نے انہیں بری طرح چونکا دیا۔ انہوں نے ہڑبڑائی ہوئی نگاہوں سے

ایک دوسرے کو دیکھا' پھر یکے بعد دیگرے میری جانب دیکھتے ہوئے متاملانہ انداز میں بولے۔

''ج...... جی...... کیا مطلب ہے...... آپ کا......؟''

ان کی گھبراہٹ نے بڑے واضح انداز میں مجھے بتا دیا کہ محض دال میں کچھ کالا ہی نہیں بلکہ پوری دال ہی کالی ہے۔ فوجی چاچا کی بجھائی ہوئی بات اس موقع پر بہت کام آ رہی تھی۔

''میرا مطلب وہی ہے جو آپ دونوں بڑی اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے' شرمیلی فاروق احمد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ اسے کوئی اور لڑکا پسند تھا......؟''

''آپ کو کسی نے بہت غلط بتایا ہے تھانیدار جی۔'' افتخار علی نے سچویشن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہماری شرمیلی ایسی بچی نہیں تھی جناب!''

''وہ ایسی تھی یا نہیں' میں دومنٹ میں آپ کی نظروں کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔'' میں نے خاصے سخت لہجے میں کہا۔ ''شاہدہ' شرمیلی کی رازدار سہیلی ہے نا' یہ تو اس کے ہر چھوٹے بڑے معاملے سے اچھی طرح واقف ہوگی۔ جب میں تھانے لے جا کر اس سے تفتیش کروں گا نا' تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا...... آپ لوگ مجھے سختی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں تو اچھا ہی ہے۔''

میرے ان دھمکی آمیز الفاظ نے ان دونوں کے مزاجوں پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔ رفعت کی پریشانی ان لمحات میں ساتویں آسمان کو چھو رہی تھی۔ وہ اپنے دیور کی طرف دیکھتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں بولی۔

''افتخار...... میرا خیال ہے' تھانیدار جی کو...... سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہئے۔ یہ ہمارے ہمدرد ہیں اور شرمیلی کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں۔''

گویا بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ میں نے طنزیہ نظر سے افتخار علی کی طرف دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''افتخار علی! تم سے کہیں زیادہ سمجھ دار تو تمہاری یہ بھابی ہے جسے دوست اور دشمن کی بخوبی پہچان ہے۔''

''میں نے تو جی......'' وہ کھسیاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ''گھر کا پیٹ چھپانے کی

کوشش کی تھی...... جب بھابی کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر اسی کی زبانی سن لیں آپ یہ کہانی بھی......!''

''کہانی تو میں رفعت بی بی کی زبانی سن ہی لوں گا افتخار علی......!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن آج تم بھی میری ایک بات بڑی مضبوطی سے اپنے پلے باندھ لو۔ زندگی میں کبھی کام آئے گی......!''

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کون سی بات جناب......؟''

''یہ بات کہ......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تھانیدار اپنے تھانے کی حدود میں آنے والے علاقے کی دائی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے پیٹ چھپا کر کسی بھی گھر کا مسئلہ حل کرایا نہیں جا سکتا۔''

میری اس پرمغز نصیحت پر وہ شرمندہ سا ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں رفعت بی بی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اگلے تین منٹ میں رفعت بی بی کی معرفت میرے علم میں کچھ اس قسم کا اضافہ ہو چکا تھا کہ زرینہ عرف شرمیلی سوہدرہ ہی کے ایک جوان مشتاق عرف کھنڈی کی محبت میں گرفتار تھی۔ کھنڈی کے نام سے مشہور یہ لڑکا کبڈی کا ایک ستھرا کھلاڑی تھا اور اکھاڑے میں پہلوانی وغیرہ بھی کرتا تھا لیکن یہی کھنڈی شرمیلی کے والدین کو سخت ناپسند تھا کیونکہ سوہدرہ میں اس کی شہرت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ وہ بھنگ اور چرس وغیرہ کا نشہ کرتا تھا اور ہلکی پھلکی غنڈہ گردی بھی اس کے نامہ اعمال میں رقم تھی لہٰذا نیاز علی اور رفعت بی بی کسی بھی قیمت پر شرمیلی کی شادی کھنڈی کے ساتھ کرنے کو تیار نہیں تھے......!

یہ تمام معلومات خاصی اہمیت کی حامل تھیں جو اس جانب اشارہ کرتی تھیں کہ شرمیلی اپنی مرضی سے کہیں نکل گئی تھی اور اس ''کہیں'' کا سیدھا سیدھا مطلب تھا...... کھنڈی!

میں نے رفعت بی بی سے سوال کیا۔ ''جب تم ان تمام حالات سے اچھی طرح واقف ہو تو پھر تم نے شرمیلی کی گمشدگی کے بعد مشتاق عرف کھنڈی کو تو ضرور چیک کیا ہوگا؟''

''جی، سب سے پہلے ہم نے اسی کے گھر میں جھانکا تھا۔'' رفعت کے بجائے افتخار علی نے جواب دیا۔ ''اس کے گھر سے پتا چلا ہے کہ کھنڈی پچھلے دو دن سے سوہدرہ میں ہی نہیں ہے۔''

''وہ کہاں گیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی ماں نذیراں نے بتایا ہے کہ وہ اپنی خالہ بشیراں کے گھر گیا ہوا ہے۔'' رفعت بی بی نے جواب دیا۔ ''بشیراں گجرات شہر میں رہتی ہے۔ نذیراں کا کہنا ہے کہ کھنڈی تین چار دن کے بعد ہی واپس آئے گا۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں کھنڈی، نذیراں اور بشیراں...... سب کو باری باری چیک کروں گا لیکن پہلے اس گھر میں کام مکمل ہو جائے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر محمد بوٹا کی صدا ابھری۔ ''آ جائیں ملک صاحب! دلہن کا کھرا مل گیا ہے۔''

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھک سے باہر نکلا۔ محمد بوٹا چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے، گمشدہ دلہن ان سیڑھیوں کے ذریعے مکان کی چھت پر پہنچی تھی اور پھر وہیں سے وہ فرار ہوئی ہے۔''

''چھت سے فرار ہوئی ہے......!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے بوٹا جی......؟''

''سرکار! میں نے چھت پر چڑھ کر دلہن کے کھرے کا مکمل تعاقب کیا ہے جی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''ان تیرہ چودہ مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ دلہن کا کھرا ایک چھت سے دوسری اور دوسری سے تیسری چھت پر سے ہوتے ہوئے سب سے آخری گھر کی چھت تک گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ......'' وہ سانس لینے کیلئے متوقف ہوا، پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''چیک یہ کرنا ہوگا جناب کہ فرار ہونے والی دلہن آخری مکان کے اندر اتری ہے یا گھر کی عقبی جانب کود گئی ہے۔ ان مکانوں کی قطار کے پیچھے کھلا میدان ہے۔''

میں نے رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس آخری گھر میں کون رہتا ہے؟''

''وہ جی رمضان اور صغریٰ کا گھر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے پانچ بچوں کے ساتھ وہاں رہتے ہیں۔''

''کیا تم نے شرمیلی کو رمضان اور صغریٰ کے گھر میں بھی دیکھا تھا؟''

''جی' وہاں بھی تلاش کیا تھا'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن ان لوگوں کو بھی شرمیلی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ اگر وہ ان کے گھر میں اتری ہوتی تو وہ لوگ مجھے ضرور بتا دیتے۔''

''اس کا مطلب ہے' وہ مکان کی عقبی سمت میدان میں کودی ہوگی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا' پھر محمد بوٹا کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا'' بوٹا جی' اب کھرے کا سلسلہ آخری مکان کے عقب سے شروع کیا جائے...... کیا خیال ہے؟''

''بڑا نیک خیال ہے جناب۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں' کیونکہ دلہن کے پاؤں کا کھرا بھی اسی بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وہ مکان کے پیچھے میدان میں کودی ہوگی۔''

''تو چلیں' پھر ادھر ہی چلتے ہیں......'' میں نے دروازے کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا' پھر شاہدہ کو مخاطب کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں اضافہ کیا۔

''جب تک میں واپس نہیں آجاتا' تم ادھر ہی رہوگی۔ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔''

''جی......!'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور خاموش ہوگئی۔

میں کھوجی محمد بوٹا کے ہمراہ رفعت بی بی کے گھر سے باہر نکلا تو اسی وقت شرمیلی کا باپ نیاز علی ڈاکٹر کو دکھا کر واپس آگیا۔ وہ ایک مسکین صورت ادھیڑ عمر شخص تھا' بیٹی کی گمشدگی نے جسے اور بھی یتیم بنا دیا تھا۔ وہ شکل ہی سے جورو کا غلام دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس سے رسمی سی علیک سلیک کی اور تسلی دینے کے بعد آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے مجھے افتخار علی کی آواز سنائی دی۔

''تھانیدار صاحب! آپ لوگ چلیں۔ میں بھائی صاحب کو اندر لٹا کر آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......!'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور محمد بوٹا کے ساتھ اپنے مطلوبہ مقام کی جانب قدم بڑھانے لگا۔

کانسٹیبلز تجمل حسین اور صفدر علی میرے حکم کے مطابق اپنی ڈیوٹی پر مستعد کھڑے نظر آرہے تھے۔ جلد ہی ہم مکانوں کی قطار کو ''پھلانگتے'' ہوئے آخری گھر کے عقب میں پہنچ گئے۔ محمد بوٹا نے پہلے کمر کے بل جھک کر اور پھر اکڑوں بیٹھ کر بڑے ماہرانہ انداز میں کچی زمین کا معائنہ فرمایا' پھر سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! کام بن گیا ہے......''

''کام بن گیا ہے!'' میں نے امید بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مطلب یہ کہ......شرمیلی کا سراغ مل گیا ہے؟''

''جی ہاں...... میں یہی کہہ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ لڑکی مکان کی چھت سے کودنے کے بعد اس طرف گئی ہے۔''

محمد بوٹا نے میدان کی دوسری جانب اشارہ کیا تھا جدھر مکانوں کی ایک دو مزید قطاریں بنی ہوئی تھیں اور ایک کچا مکان ذرا ہٹ کر تھوڑے فاصلے پر تن تنہا دکھائی دے رہا تھا۔ اس مکان سے آگے وہ راستہ تھا' جو میرے تھانے اور بس سٹینڈ کی طرف جاتا تھا۔ میں محمد بوٹا کی معیت میں رفتہ رفتہ میدان عبور کرنے لگا۔ محمد بوٹا نے شرمیلی کا کھرا پکڑ رکھا تھا اور میں نے محمد بوٹا کو......ہم سست روی سے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔

ابھی ہم نے میدان کے اندر نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ میں نے ایک گھڑسوار کو سامنے والے مکانوں کی قطار کے عقب سے نمودار ہوکر مذکورہ کچے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس گھڑسوار کو دیکھ کر میں چونک اٹھا تھا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا تھا۔

''یہ کون ایسی تیزی سے کچے مکان کی طرف جارہا ہے......؟''

محمد بوٹا کا دھیان چونکہ کھرا اٹھانے کی طرف لگا ہوا تھا لہٰذا میرے توجہ دلانے پر اس نے گردن اٹھا کر کچے مکان کی سمت دیکھا لیکن اس اثنا میں مذکورہ گھڑسوار کچے مکان کے عقب میں غروب ہوچکا تھا۔

''ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے ملک صاحب!'' محمد بوٹا نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''پہلے تھا...... اب نہیں ہے......'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''وہ تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے ان مکانوں کے پیچھے سے نکلا تھا اور کچے مکان کے پیچھے غائب ہوگیا ہے۔ پتا نہیں کیوں' مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس گھڑسوار کو میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔''

''ملک صاحب! آپ نے ایک لمحے کیلئے اسے دیکھا ہے نا' اس لئے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں' ہم اسی کچے مکان کی طرف جارہے ہیں۔ ابھی پتا چل جائے گا' وہ گھڑسوار کون ہے......!''

"ہم کچے مکان کی طرف کیوں جا رہے ہیں بوٹا جی؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اس لئے جا رہے ہیں کہ دلہن شرمیلی کے پاؤں کا کھرا اسی سمت ہمیں لے کر جانا چاہتا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میرا تجربہ بتا رہا ہے کہ اس میدان سے گزرتے ہوئے وہ لڑکی اسی کچے مکان کی طرف گئی ہے......" بات کے اختتام پر محمد بوٹا نے متذکرہ بالا کچے مکان کی جانب اشارہ بھی کر دیا تھا۔

"کیا واقعی......؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

اس سے پہلے کہ محمد بوٹا میرے سوال کا جواب دیتا' سوہدرہ کی فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ ہم دونوں نے چوکنا نظروں سے کچے مکان کی طرف دیکھا کیونکہ گولی چلنے کی آواز اسی جانب سے آئی تھی۔

میں نے سروس ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھاما اور پلک جھپکتے میں کچے مکان کی سمت دوڑ لگا دی۔ جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیچھے بھی دوڑتے ہوئے قدم مصروف عمل ہیں۔ میں نے دوڑنے کے دوران میں پلٹ کر عقب میں دیکھا تو مجھے کانسٹیبل تجمل حسین اور صفدر علی کی صورتیں دکھائی دیں۔ وہ بھی بھاگتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔

میں ابھی مذکورہ کچے مکان سے سو گز کے فاصلے پر ہی تھا کہ اس مکان کے پیچھے سے ایک گھڑ سوار برآمد ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ گھوڑا تو وہی تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے اس مکان کے عقب میں غروب ہوتے دیکھا تھا لیکن اس بار گھڑ سوار وہ نہیں تھا' لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز اور دلچسپ بات یہ تھی کہ مذکورہ گھڑ سوار کو بھی دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے...... پھر اگلے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ وہ کون ہے۔

ماموں تکے والے پر قاتلانہ حملہ کرنے والے اجنبی لفنگے کا حلیہ میرے ذہن میں نقش تھا اور یہ گھڑ سوار اس حلیے پر صد فیصد فٹ بیٹھتا تھا۔ اس کے فرار ہونے کا انداز گواہی دیتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اسی نے ایک گولی فائر کی ہوگی...... یہ احساس ہوتے ہی میں نے اس گھڑ سوار کو للکارا۔

"رک جاؤ...... ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

میرے ان دھمکی آمیز الفاظ کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے مجھ پر جوابی فائرنگ کی اور گھوڑے کو مزید تیز بھگانا شروع کر دیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے نیچے جھک کر خود کو بچا لیا۔ یہ بڑے فیصلہ کن لمحات تھے۔ میں اس بھگوڑے گھڑ سوار کو ڈرانے دھمکانے میں وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا' پھر میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔

میں نے کسی ماہر نشانچی کے مانند بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹانگوں کا نشانہ باندھ کر یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیئے۔

میری یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ میرے ریوالور سے نکلنے والی گولیوں نے گھوڑے کی ٹانگوں کو بری طرح گھائل کر ڈالا تھا۔ وہ بڑے کرب ناک انداز میں بلبلایا' پھر لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ تکلیف کی شدت سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

گھوڑے کے گرتے ہی گھڑ سوار کے بدن نے بھی میدان کی سنگ ریز زمین کو ایک زوردار بوسا دیا' پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر کھڑا ہوتا اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا' میں نے اس کے سر پر پہنچ کر اسے قابو کر لیا۔ اس کی جانب اٹھی ہوئی میرے ریوالور کی خطرناک نالی نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اگر وہ ایک انچ بھی ادھر ادھر ہلا تو اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ جائیں گے...... اس کا پستول زمین پر گرتے ہی ہاتھ سے نکل کر دور جا گیا تھا۔

اگلے ہی لمحے صرف تجمل حسین اور صفدر علی ہی نہیں بلکہ مزید نصف درجن افراد بھی جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ یہ فوجی چاچا کی ٹیم کے لوگ تھے جنہیں میں نے گاؤں کے گرد متعین کر رکھا تھا۔ انہی لوگوں میں فرید بخاری عرف فوجی چاچا بھی بہ نفس نفیس موجود تھا۔

میں نے اجنبی مجرم کو الٹی ہتھکڑی لگا کر صفدر علی اور تجمل حسین کے حوالے کیا اور خود بخاری صاحب کے ساتھ اس کچے مکان کی جانب بڑھ گیا جہاں سے پہلی گولی چلنے کی صدا ابھری تھی۔

وہ ایک متروک متنازعہ چھوٹا سا مکان تھا جہاں پچھلے سال' ڈیڑھ سال سے کوئی بھی نہیں رہ رہا تھا۔ بعدازاں مجھے پتا چلا کہ مذکورہ مکان کا کیس وزیر آباد کی ایک عدالت میں چل رہا تھا اور عدالت ہی کے حکم پر اس کچے مکان کو تالا بند کر دیا گیا تھا لیکن موجودہ حالات چیخ چیخ کر اس حقیقت کی گواہی دے رہے تھے کہ اس مکان کو غلط مقاصد کیلئے استعمال کیا گیا تھا۔

ہم جیسے ہی مکان کے اندر داخل ہوئے' صورتحال کھل کر سامنے آ گئی۔ دو کمروں والے

اس مکان کے کچے صحن میں افتخار علی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے سے ابلنے والے خون نے اسے نہلا سا دیا تھا۔ اسی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے افتخار علی ہی کو گھوڑے پر سوار اس مکان کے پیچھے غروب ہوتے دیکھا تھا۔ دراصل مذکورہ مکان کی پشت میدان کی سمت تھی اور سامنے والا حصہ اس راستے کی جانب تھا جو تھانے کی طرف جاتا تھا۔

کمروں کی تلاشی بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ ایک کمرے میں سے شرمیلی بازیاب ہوگئی لیکن انتہائی خراب حالت میں۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کمر کو رسی کی مدد سے ایسا کس کر باندھا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ایک انچ حرکت نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر بند کردیا گیا تھا تاکہ وہ اس بہیمانہ سلوک پر صدائے احتجاج بلند کرنے کے قابل نہ رہے۔

میں نے پہلی فرصت میں شرمیلی کی ساری بندشیں کاٹ ڈالیں اور اس کے منہ کو بھی فی الفور آزاد کردیا' پھر اسے ایک چارپائی پر بٹھا کر پانی پلایا۔ اس دوران میں فوجی چاچا بھاگ کر کہیں سے پانی لے آیا اور اس کے ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی پورے سوہدرہ میں پھیل گئی کہ گمشدہ دلہن زرینہ عرف شرمیلی کو بازیاب کرلیا گیا ہے۔

گاؤں والے جوق در جوق اس کچے مکان کی جانب دوڑ پڑے جہاں اس وقت میں موجود تھا۔ آپ خود ہی تصور کرلیں کہ میں اس صورتحال سے کیسے نمٹا ہوگا۔



شرمیلی کی شادی کو ایک ماہ کیلئے مؤخر کردیا گیا تھا۔

وہ جن حالات سے گزری تھی اس کے پیش نظر خوشی یا شادی وغیرہ کا تصور وقتی طور پر دھندلا سا گیا تھا۔ اس افسوسناک واقعہ کا اختتام جتنا ڈرامائی اور سنسنی خیز ہوا تھا میں اس کہانی کے تین اہم کرداروں میں سے دو کے بیانات کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ پیش منظر کے ساتھ ہی اس داستان کا پس منظر بھی آپ کے ذہن میں نقش ہوجائے۔ میں نے جن دو کرداروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک تو ہے زرینہ عرف شرمیلی اور دوسرا ہے' یعقوب عرف قوبا...... جی ہاں' یہ قوبا وہی نامراد شخص ہے جس نے پچھلی رات ماموں تکے والے کو شدید زخمی کردیا تھا۔

اس کہانی کے تیسرے اہم کردار کا محض ذکر ہی کیا جاسکتا ہے کیونکہ اب وہ کسی بیان شیان کے قابل نہیں رہا تھا۔ میرا اشارہ افتخار علی کی جانب ہے......!

شرمیلی کے مطابق' اسے دن میں ایک چھوٹے بچے کے ہاتھ ایک چٹھی ملی تھی۔ اس نے تنہائی میں جب چٹھی کو کھول کر پڑھا تو پتا چلا' وہ خط اس کے محبوب مشتاق عرف کھنڈی کی جانب سے تھا اور اس نے شرمیلی سے آخری ملاقات کیلئے التجا کی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس خط کے ذریعے سختی سے یہ تاکید بھی کردی تھی کہ یہ معاملہ صرف انہی دونوں کے بیچ رہے اور شرمیلی نے کھنڈی کی ہدایت پر من وعن عمل کرتے ہوئے اپنی رازدار سہیلی کو بھی اس معاملے کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ اگلے دن اس کی رخصتی تھی اور وہ بھی سوہدرہ چھوڑنے سے پہلے ایک بار اپنے محبوب سے اچھی طرح مل لینا چاہتی تھی۔ کھنڈی نے چٹھی میں ملاقات کیلئے شرمیلی کو باقاعدہ ایک پروگرام دیا تھا جس کے مطابق آدھی رات کے بعد جب گھر کے تمام افراد گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہوں تو شرمیلی کو چپکے سے اپنے مکان کی چھت پر پہنچنا تھا اور پھر چھت در چھت سفر کرتے ہوئے گلی کے آخری مکان تک رسائی حاصل کرنا تھی جہاں مکان کے عقب میں اسے دیوار کے ساتھ ایک بانس کی سیڑھی لگی ہوئی ملتی۔ اسے سیڑھی کے ذریعے مکان کی چھت سے نیچے اترنا تھا اور پھر میدان کو عبور کرکے اس کچے مکان تک پہنچنا تھا جو کافی عرصے سے کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ کھنڈی نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ مذکورہ کچے مکان کے اندر اس کا انتظار کررہا ہوگا۔ وہ خاموشی کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہوکر اس تک پہنچ جائے۔ کھنڈی نے واضح کردیا تھا کہ وہ مکان کے داخلی دروازے کو کھلا رہنے دے گا لہٰذا وہ بے دھڑک اندر آجائے۔ واپسی میں وہ شرمیلی کو اس سیڑھی تک پہنچانے ساتھ آئے گا جس کے ذریعے اسے واپس اپنی گلی کے آخری مکان کی چھت تک پہنچنا تھا۔ اس کے بعد کھنڈی وہاں سے سیڑھی ہٹادیتا اور وہ اپنے گھر آجاتی...... اللہ اللہ' خیر سلا!

شرمیلی نے اس ملاقات والے معاملے کو صیغہ راز میں رکھتے ہوئے کھنڈی کی بھیجی ہوئی چٹھی کے مطابق عمل کرڈالا اور جب اسے اپنی گلی کے آخری مکان کے پچھواڑے ایک دیوار کے ساتھ بانس کی سیڑھی لگی نظر آئی تو اسے یقین ہوگیا کہ کھنڈی اس کچے غیر آباد مکان میں ضرور اس کا انتظار کررہا ہوگا۔ وہ میدان عبور کرکے کشاں کشاں اپنے محبوب سے ملاپ کیلئے اس مکان کے اندر داخل ہوگئی۔

قوبا پہلے سے گھات لگائے وہاں بیٹھا شرمیلی کا انتظار کررہا تھا۔ اسے بے بس کرکے ایک چارپائی پر ڈال دیا۔ قوبا ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ لہٰذا شرمیلی پر قابو پا کر اسے رسیوں میں

ہلز نے کا مرحلہ اس کیلئے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ شرمیلی اس کچے مکان میں دیدار یار کیلئے گئی تھی اور ایک خطرناک مصیبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے' قوبا ایک جرائم پیشہ شخص تھا' اس کا تعلق حافظ آباد کے ایک گاؤں سے تھا۔ سوہدرہ میں کوئی اس کی صورت نہیں پہچانتا تھا اور جسے بقول قوبا ہی کے' افتخار علی نے ایک خاص مشن کیلئے چن لیا تھا۔ قوبا کی خدمات کا آدھا معاوضہ اس نے ایڈوانس میں وصول کیا تھا اور باقی کا آدھا کام کی تکمیل کے بعد اسے ملنا تھا۔

قوبا کے بیان کے مطابق اسے سوہدرہ کے ایک غیر آباد مکان میں بیٹھ کر کسی حسین و جمیل لڑکی کا انتظار کرنا تھا۔ افتخار علی نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس نے لڑکی کو مذکورہ مکان تک پہنچانے کا بڑا پکا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ آدھی رات کے بعد اکیلی اس مکان میں پہنچ جائے گی۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شرمیلی تک کھنڈی کے حوالے سے جو خط پہنچا تھا' وہ سراسر افتخار علی ہی کی کارستانی تھی۔ کھنڈی تو سوہدرہ میں موجود ہی نہیں تھا۔ افتخار علی کو چونکہ شرمیلی کی کمزوری کا پتا تھا لہٰذا اس نے یہی چال چلی تھی اور شرمیلی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی چال میں آ بھی گئی تھی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ اس کا محبوب شخص اس سے ملاقات کیلئے گجرات سے واپس آ گیا تھا۔ اس کی قسمت بری کہ وہ نقلی چٹھی کے فریب میں آ گئی تھی۔

رات کے آخری حصے میں افتخار علی قوبا کے پاس پہنچا اور مکان کے اندر داخل ہوئے بغیر دروازے پر ہی کھڑے کھڑے پہلی لڑکی کی آمد کی تصدیق کی' پھر اس نے قوبا سے سرگوشی میں کہا۔ ''بیوقوف! تمہاری حماقت نے بڑی گڑبڑ کر دی ہے......!''

''میں نے کیا حماقت کی ہے؟'' قوبا نے اس سے پوچھا۔

''تم نے تکے والے اس بڈھے سے جو جھگڑا کیا ہے نا اس کی وجہ سے تمہیں اس وقت پورے گاؤں میں تلاش کیا جا رہا ہے۔'' افتخار نے پریشان لہجے میں بتایا۔ ''مجھے تو یہاں تک بھی پتا چل چکا ہے کہ پولیس کے سوہدرہ سے باہر جانے والے راستوں کی ناکہ بندی...... کر دی ہے لہٰذا مجھے اپنے پروگرام میں تھوڑی تبدیلی کرنا پڑے گی۔''

''کیسی تبدیلی؟'' قوبا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ جس لڑکی کو تم نے باندھ کر اندر ڈال رکھا ہے نا' اسے ختم کر دو......!''

''رقم کی تم پروا نہیں کرو' میں تمہیں خوش کر دوں گا۔'' افتخار علی نے بڑے مضبوط لہجے میں

کہا۔ ''اب میں کل صبح ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ کام ہو جانا چاہئے۔ میں تمہیں باقی کی رقم دے کر یہ بھی بتاؤں گا کہ تم کس محفوظ راستے کے ذریعے سوہدرہ سے باہر جا سکتے ہو۔ میں اس سلسلے میں ساری معلومات حاصل کر لوں گا......''

قوبا نے اسے یقین دلایا کہ اس کے کہے پر من و عن عمل کیا جائے گا۔ افتخار مطمئن ہو کر واپس چلا گیا لیکن قوبا اس کے احکام پر مطمئن نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں' وہ شرمیلی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شرمیلی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ جب افتخار علی صبح اس کے پاس آئے گا تو وہ اسے کوئی چکر دے کر لڑکی کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے جائے گا۔ اس کا جو بھی نتیجہ نکلتا' وہ بھگتنے کو تیار تھا۔

اگلی صبح صورتحال ہی بدل گئی۔ ایک تو میں نے رات ہی کو اجنبی بدمعاش یعنی قوبا کی تلاش کیلئے خاصی لمبی چوڑی کارروائی ڈال دی تھی' پھر آج صبح کھوجی بوٹا کی مدد سے میں نے شرمیلی کو بازیاب کرنے کا جو کام شروع کیا' اس نے افتخار علی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس بات کا تو اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ میری تحقیق و تفتیش بہت جلد مجھے اس کچے مکان تک پہنچا دے گی جہاں قوبا موجود تھا۔ اگر قوبا پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو افتخار علی کا کچا چٹھا کھل جانا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی اسے موقع ملا وہ ایک سنگین فیصلے کے ساتھ قوبا کی جانب روانہ ہو گیا۔

قوبا نے مجھے بتایا کہ صبح ہی سے کئی بار اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ باقی کی رقم کو بھول کر شرمیلی کے ساتھ کہیں فرار ہو جائے لیکن اس کی بدمعاشانہ سوچ نے اسے اس غلطی سے باز رکھا تھا۔ اس کے دماغ نے سمجھایا کہ اپنے کام کا پورا معاوضہ وصول کرنا چاہئے۔ اگر جیب میں نوٹ بھرے ہوں گے تو ایک سے ایک حسین لڑکی اس کے قدموں میں اپنی جوانی لٹا دے گی۔ اس موقع پر دل نے بڑی گہری چال چلی۔ اس نے دماغ کی نصیحت کا توڑ کرنے کیلئے یہ پٹی پڑھائی...... ''افتخار علی سے رقم وصول کرو' اس کے سر میں چوٹ لگا کر اسے ادھر ہی گراؤ اور ی کو لے کر جدھر جی چاہے' نکل جاؤ۔ دولت اور لڑکی دونوں ہاتھ آنا چاہئیں۔''

اس کے دل اور دماغ میں جو مختلف خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے انہوں نے قوبا کو الجھا کر رکھ دیا اور اسی سوچ بچار میں وہ افتخار علی کا انتظار کرنے لگا۔ افتخار علی ایک مختلف ذہن کے ساتھ اس کے پاس پہنچا اور مکان کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے سوال کیا۔ اس نے

اپنے لہجے کو بہت دھیما رکھا تھا۔

"لڑکی کا کام کردیا ہے نا......؟"

"رات ہی کو کر دیا تھا!" قوبا نے جواب دیا۔"اب لاؤ میری باقی رقم......!"

"باقی رقم تمہیں جہنم میں پہنچ کر ملے گی۔" یہ کہتے ہوئے افتخار علی نے پستول نکال لیا۔

قوبا بھونچکا رہ گیا۔سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔"کیا مطلب......؟"

"پولیس نے لڑکی کا سراغ لگا لیا ہے۔وہ دس منٹ کے بعد یہاں پہنچ جائے گی۔" افتخار علی نے سفاکی سے کہا۔"اگر تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو میرا بھانڈا پھوٹ جائے گا' اس لئے میں پولیس کی آمد سے پہلے ہی تمہیں جہنم روانہ کررہا ہوں۔"

موت کو سامنے دیکھ کر انسان دنیا کا ہر عیش و آرام بھول جاتا ہے اور اسے اپنی بقا کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ان لمحات میں قوبا بھی رقم اور لڑکی کو فراموش کر بیٹھا تھا۔وہ چیتے کی مانند افتخار علی پر جھپٹا اور اس کے گولی چلانے سے پہلے ہی اس کا پستول چھین لیا' پھر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس نے افتخار علی کے سینے میں گولی اتاری اور اسی کے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی۔اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کا احوال آپ پچھلے صفحات پر پڑھ چکے ہیں۔

افتخار علی اب اس دنیا میں باقی نہیں تھا جو کسی تصدیق یا تردید کیلئے اس سے سوال و جواب کئے جاتے۔اس تمام تر بکھیڑے کے اختتام پر میں نے رفعت بی بی سے صرف ایک ہی سوال کیا تھا۔

"افتخار علی کی آپ لوگوں کے ساتھ آخر ایسی کون سی دشمنی تھی کہ اس نے شادی سے ایک دن پہلے اپنی سگی بھتیجی کے ساتھ یہ سلوک کیا......؟"

"اللہ تعالیٰ شاید نیاز علی کو کوئی سبق سکھانا چاہتا تھا۔" وہ گھمبیر انداز میں بولی۔"سانپ کے بچے کو چاہے کتنا بھی دودھ پلا دو وہ ڈسنے سے باز نہیں آتا......"

اس "فلسفے" کے بعد رفعت بی بی نے مجھے ایک واقعہ سنایا جس کا خلاصہ چند سطروں میں کچھ یوں بنتا ہے......"نیاز علی اور افتخار علی میں شرمیلی کے رشتے پر ان بن ہوگئی تھی۔افتخار علی شرمیلی کو اپنی بہو بنانا چاہتا تھا لیکن رفعت نے صاف انکار کردیا۔لگ بھگ ایک سال تک دونوں بھائیوں میں شدید مخالفت رہی۔اب نیاز علی ہی کی منت خوشامد کے بعد یہ تعلقات

بحال ہوئے تھے۔افتخار نے اوپری دل سے صلح تو کرلی تھی لیکن موقع ملتے ہی وہ بس گھولنے سے باز نہیں آیا تھا۔وہ شرمیلی کو منظر سے غائب کرکے رفعت بی بی کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتا تھا۔"

یہ رفعت بی بی کا نقطہ نظر تھا۔اگر افتخار علی زندہ ہوتا تو میں اس کا مؤقف بھی جان سکتا تھا چونکہ ایسا ممکن نہیں رہا تھا لہٰذا مجھے رفعت بی بی اور یعقوب عرف قوبا کے بیانات پر یقین کرنا پڑا اور ان دونوں کے بیانات آپس میں لگا کھاتے تھے۔



پہاڑ او جھل

بعض لوگ بڑے عجیب ہیں!

وہ اچانک آپ کے سامنے آ کر کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں کہ آپ چونک جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک نامعلوم سا تجسس جاگ اٹھتا ہے اور جب وہ زبان کھولتے ہیں تو فضا میں سنسنی سی پھیل جاتی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ پوری توجہ سے اس کی بات سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جما بھی ایک ایسا ہی کردار تھا......!

وہ ماہ جولائی کے اختتامی ایام تھے۔ ساون اپنے جوبن پر تھا۔ رات کو سونے کیلئے لیٹو تو بارش ہو رہی ہے۔ صبح آنکھ کھلے تو بارش موجود اور دن بھر بھی گاہے بگاہے یہ اپنی شکل دکھانے سے باز نہیں آ رہی۔ معمولات زندگی بری طرح متاثر ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسی ہی ایک برساتی شام میں‘ میں تھانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ جما مجھ سے ملنے آ گیا۔ اگر وہ پانچ‘ دس منٹ لیٹ ہو جاتا تو میں کمرے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں جا چکا ہوتا۔

کانسٹیبل باسط نے کمرے میں آ کر مجھے بتایا۔ ”ملک صاحب! ایک بندہ آپ سے ملاقات کرنے آیا ہے......!“

”برستی بارش میں یہ کون مجھ سے ملنے آ گیا!“ میں نے سوالیہ نظر سے باسط کی جانب دیکھا۔ ”لگتا ہے‘ کوئی سنگین معاملہ ہی ہے ورنہ ایسی ایمرجنسی کی کیا ضرورت تھی......“

”جناب! میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی ہے۔“ کانسٹیبل نے بتایا۔ ”لیکن وہ ایک ہی ضد پر اٹکا ہوا ہے کہ آپ سے مل کر ہی اپنی آمد کے بارے میں بتائے گا۔“

”ٹھیک ہے‘ بھیجو اسے اندر۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”دیکھوں تو سہی‘ وہ ہے

کون اور کون سی اطلاع لے کر آیا ہے۔“

”جی اچھا ملک صاحب!“ باسط یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند سیکنڈ کے بعد جما میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا مالک ایک ایسا شخص تھا جس کی شناختی علامات بڑی واضح تھیں۔ وہ ایک آنکھ سے محروم اور ایک ٹانگ سے معذور تھا اور یہ تمام تر محرومی و معذوری جسم کے بائیں حصے میں واقع ہوئی تھی۔ وہ جب گڑگڑاتے ہوئے میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں چونک کر رہ گیا تھا ایک محروم اور معذور شخص کا بارش میں مجھ سے ملنے آنے کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ میرے تھانے کی حدود میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ میں نے تشویش بھری نظر سے اپنے سامنے بیٹھے جما کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا‘ اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

”تھانیدار صاحب! اگر معاملہ سنگین نہ ہوتا تو میں اتنی بارش میں کبھی آپ کے پاس نہ آتا۔“

”ہاں...... وہ تو مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”لیکن تمہارا لباس تو بالکل خشک ہے‘ کیا بارش نے تمہارا مزاج نہیں پوچھا؟“

”جناب‘ یہ کسی کو معاف نہیں کرتی۔“ اس نے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا مزاج بھی ضرور پوچھتی لیکن میں نے موم جامہ اوڑھ رکھا تھا‘ اس لئے اس کی مہربانی سے محفوظ رہا ہوں۔“

گاؤں دیہات میں بارش کے دوران میں لوگ عموماً موم جامہ اوڑھ کر باہر نکلتے ہیں‘ یہ موم جامہ کوئی خاص قسم کا اوڑھنا نہیں ہوتا بلکہ موم کی‘ بڑے سائز کی تھیلی کی ایک سائیڈ لمبائی کے رخ پر کھول لی جاتی ہے اور کسی ٹوپے والے جبے کے مانند اسے پہن لیا جاتا ہے۔

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”جما! وہ کون سا سنگین معاملہ ہے جس نے اس برسات کے موسم میں تمہیں تھانے آنے پر مجبور کر دیا ہے؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے ایک مرتبہ پھر چوکنا نظر سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا‘ پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ”تھانیدار صاحب! سخاوت کوچوان کی لڑکی غائب ہوگئی ہے۔“

اس کے انکشاف نے مجھے چونکا دیا اور میں اضطراری انداز میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''سخاوت کوچوان......؟''

''جی ہاں!'' اس نے بڑے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ ''سخاوت کی گم ہونے والی لڑکی کا نام نازلی ہے جناب اور وہ آج صبح ہی سے لاپتا ہے۔''

''اب تو شام ہو رہی ہے۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''اگر نازلی صبح سے لاپتا ہے تو اس کے باپ نے ابھی تک یہاں آ کر رپورٹ کیوں نہیں کرائی......؟''

''ایک وجہ تو یہ بارش ہے تھانیدار صاحب!'' وہ آواز دبا کر بولا۔ ''اور دوسرا سبب عزت وغیرہ کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ سخاوت اپنے طور پر نازلی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ابھی تک یہ خبر عام نہیں ہوئی۔ بس' مجھے کہیں سے پتا چل گیا ہے۔ سخاوت کی خواہش ہے کہ وہ اس واقعہ کی دھوم مچنے سے پہلے ہی کسی نہ کسی طرح نازلی کو ڈھونڈ نکالے تا کہ پھر گاؤں والوں اور خصوصاً خاندان والوں کو یہ نہ بتانا پڑے کہ نازلی کہاں گئی تھی اور اسے کہاں سے تلاش کیا گیا ہے۔''

''ہوں......!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا' پھر جما کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''کچھ نہیں جناب......!'' وہ اپنی اکلوتی آنکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تو جی بس' ہمدردی میں آپ کو یہ سنسنی خیز اطلاع دینے آ گیا ہوں۔''

''کس کی ہمدردی میں؟'' میں نے پوچھا۔ ''سخاوت کوچوان کی یا پولیس کی ہمدردی میں......!''

''دونوں ہی کی سمجھ لیں سرکار......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ کی کوشش سے سخاوت کی لڑکی مل جائے گی تو اس میں دونوں ہی کا فائدہ ہے نا۔ نازلی خیر' خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائے گی اور آپ کے ریکارڈ میں ایک اور کارنامے کا اضافہ ہو جائے گا۔''

''تمہاری فرض شناسی نے مجھے متاثر کیا ہے جما!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا' پھر پوچھا۔ ''کیا تم ادھر ایمن آباد ہی میں رہتے ہو؟''

ان دنوں میری تعیناتی ایک ایسے تھانے میں تھی جس کی حدود میں قصبہ ایمن آباد بھی آتا تھا اور اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی مجھے لگ بھگ ایک ماہ ہی ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں

جھنگ صدر کے ایک تھانے میں پیشہ ورانہ فرائض ادا کر رہا تھا۔ ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ کی حدود میں آتا تھا۔

جما نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جناب! جبھی تو مجھے پتا چلا ہے کہ سخاوت کی لڑکی نازلی گھر سے غائب ہے۔''

یہ جواب اس بات کی تصدیق تھا کہ جما ایمن آباد ہی کا رہائشی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''تم کرتے کیا ہو؟''

''وہ جی' میں کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان چلاتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''تمہارا اصل نام کیا ہے؟''

''نام تو میرا جمال دین ہے جی۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''لیکن سب مجھے جما جما ہی کہتے ہیں اور......بعض تو ''جما جنج نال'' بھی کہہ دیتے ہیں۔''

''تمہاری سخاوت علی کے ساتھ کوئی رشتے داری تو نہیں ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے' گم ہونے والی لڑکی نازلی تمہاری کچھ لگتی تو نہیں......؟''

''کچھ نہیں جناب۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''بس' محلے داری سمجھ لیں۔''

''ٹھیک ہے جما......!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ اہم اطلاع دینے کیلئے میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن اس سلسلے میں فی الحال میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا۔''

''کیا مطلب تھانیدار صاحب......؟'' وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی چشم یک کے اطمینان کی خاطر کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ جما کہ جب تک نازلی کے گھر والوں یعنی اس کے ورثاء میں سے کوئی تھانے آ کر اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہ کرا دے' میں نازلی کی تلاش کیلئے قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتا' البتہ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''البتہ' میں اپنے عملے کے ایک مقامی کانسٹیبل کو اس معاملے کی سن گن کیلئے مقرر کر دیتا ہوں تا کہ مجھے تازہ ترین حالات کا پتا چلتا رہے۔''

''ٹھیک ہے جناب! آپ اتنا ہی کر لیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''لیکن میرے سرگرم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ۔'' میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تم اپنی آنکھیں اور کان مسلسل کھلے رکھو گے اور جیسے ہی

تمہیں کام کی کوئی بات معلوم ہو' تم سیدھا میرے پاس آ کر بتاؤ گے۔ سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں......؟''

''بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا' پھر اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں گھمانے کے بعد یہ اضافہ کیا۔''آپ اس سلسلے میں تو بالکل بےفکر ہو جائیں۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔''تو آپ اب مجھے اجازت دیں۔ میں اپنی دکان پر گوشی کو بٹھا کر آیا ہوں۔''

''یہ گوشی کون ہے؟'' میں نے رواداری میں پوچھ لیا۔

''گوشی میرا آٹھ سالہ بیٹا ہے جناب......'' جما نے بتایا۔''نام تو اس کا نصیر ہے لیکن لوگ اسے گوشی کہہ کر بلاتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''وہ بچپن میں بالکل بگوگوشے (ناشپاتی) کی طرح کا تھا اسی لئے گوشی مشہور ہو گیا اور......ابھی بھی وہ ایسا ہی ہے۔''

میں نے جمال دین عرف جما کو جانے کی اجازت دی۔ وہ جس طرح لنگڑاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا تھا بالکل ویسے ہی لنگڑاتے ہوئے واپس چلا گیا اور جاتے جاتے مجھ سے ایک وعدہ بھی لے گیا۔ جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا تو اس نے درخواست آمیز انداز میں مجھ سے کہا تھا۔

''تھانیدار صاحب! میں تو سخاوت کی بھلائی کیلئے آپ کو اطلاع دینے آ گیا ہوں لیکن میرا نام کہیں نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ سخاوت کا دل میری طرف سے میلا ہو۔ وہ جس معاملے کو چھپا رہا ہے میں اس کو کھولنے والا مشہور ہو گیا تو وہ مجھ سے ناراض بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں تمہاری مجبوری کا خیال رکھوں گا۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔''تم مطمئن ہو کر جاؤ اور مزے سے دکان داری کرو۔''

وہ اپنی تشکر سے لبریز اکلوتی آنکھ سے مجھے دیکھنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل باسط کو اپنے پاس بلا لیا اور پوچھا۔''کیا

کانسٹیبل نوازش ڈیوٹی پر آ گیا ہے؟''

نوازش نامی یہ کانسٹیبل مقامی تھا' یعنی اس کی رہائش ادھر ایمن آباد ہی میں تھی۔ وہ آج کل شبینہ ڈیوٹی کر رہا تھا۔ باسط نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''نہیں جناب! ابھی تک تو نہیں پہنچا۔ ٹائم تو ہو گیا ہے۔ بس' آنے ہی والا ہو گا۔''

''وہ جیسے ہی آئے' اسے میرے پاس بھیج دینا۔'' میں نے کہا۔''ایک بہت ہی ضروری کام ہے اس سے......''

''اس لنگڑے نے کہیں نوازش کی کوئی شکایت وغیرہ تو نہیں کر دی۔'' باسط نے ٹٹولنے والی نظر سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں......کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''ملک صاحب! خیریت تو ہے نا......'' اس کی آنکھوں میں تشویش بھر گئی۔''یہ لنگڑا تھا کون؟''

''کیا تم اسے جانتے نہیں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب!'' باسط نے نفی میں گردن ہلائی۔''میں نے اسے آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے لیکن یہ بندہ مجھے بڑا ہی عجیب سا لگا ہے۔''

''عجیب سا......!'' میں نے چونک کر کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''پتا نہیں جناب' آپ میری بات کو مذاق سمجھیں گے۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔''لیکن میں نے جو دیکھا ہے' وہ مجھے ہضم نہیں ہو رہا......''

''تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے باسط؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''ملک صاحب! جب یہ بندہ تھانے کی عمارت میں داخل ہوا تھا تو میں نے اسے باقاعدہ لنگڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''ہاں' وہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔'' میں نے اضطراری انداز میں قطع کلامی کی۔''وہ میرے کمرے میں لنگڑاتے ہوئے ہی آیا ہے۔''

وہ بولا۔''یہ ایک اتفاق ہے کہ جب وہ شخص تھانے سے رخصت ہو رہا تھا تو بھی میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا ہے اور تبھی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ڈرامہ کر رہا ہے......''

"کس قسم کا ڈرامہ؟" اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے سوال کر دیا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ لنگڑا نہیں۔"

"کیا...... کیا مطلب؟"

"وہ جب تھانے کی عمارت سے نکل کر اپنے گھوڑے کی جانب بڑھ رہا تھا تو میں نے اسے غور سے دیکھا ہے جناب۔" باسط انکشاف انگیز لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ چند قدم تو لنگڑاہٹ بھری چال کے ساتھ آگے بڑھا' پھر جب وہ اپنے گھوڑے سے آٹھ' دس فٹ کے فاصلے پر تھا تو اس کی چال بالکل نارمل ہو گئی۔ وہ اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا اور گھوڑے کو چلاتے ہوئے جی ٹی روڈ کی طرف بڑھ گیا تھا' اسی وقت آپ نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ آگے کس سمت گیا ہے......"

باسط ایک ایسی بات بتا رہا تھا جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر جما ایمن آباد ہی کا وسنیک تھا تو پھر اسے جی ٹی روڈ کی جانب جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی کریانے کی دکان کھلی چھوڑ کر آیا تھا' اسی لئے اسے واپسی کی بھی جلدی تھی لہٰذا اسے تو فی الفور اپنی دکان پر یعنی ایمن آباد کے اندرونی حصے کی طرف جانا چاہئے تھا اور کانسٹیبل باسط کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں دیکھنے میں کوئی مغالطہ ہوا ہو؟" میں نے باسط کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "بارش کے سبب اس کی چال میں تیزی آ گئی ہو اور تمہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ لنگڑا نہیں رہا ہو بلکہ کسی صحت مند ٹانگوں والے انسان کی طرح چل کر اپنے گھوڑے کی جانب بڑھا ہو۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب!" وہ پورے یقین سے بولا۔ "میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ میں نے جو بھی دیکھا وہی آپ کو بتایا ہے۔ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔ یہ آپ کی مرضی ہے جناب۔"

"ٹھیک ہے' میں اس بندے کو چیک کروں گا۔" میں نے معاملے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تم اب جاؤ اور نوازش جیسے ہی تھانے پہنچے اسے فوراً میرے کمرے میں بھیج دینا۔"

"او کے سر......!" وہ مجھے سلیوٹ کر کے واپس چلا گیا۔

میں دراصل نوازش کو اپنے پاس بلا کر سخاوت علی کی گمشدہ بیٹی نازلی کے بارے میں

استفسار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جما کی اطلاع کے مطابق نازلی آج صبح ہی سے غائب تھی۔ نوازش چونکہ ایمن آباد ہی کا رہنے والا تھا لہٰذا نازلی کی گمشدگی کے حوالے سے اس سے زیادہ معتبر خبر کوئی اور دے نہیں سکتا تھا جبکہ وہ دن بھر گھر میں بھی رہا تھا لیکن باسط نے ابھی جما کی لنگڑاہٹ کے ذیل میں جو سنسنی خیز انکشاف کیا تھا اس کی روشنی میں جما قابل بھروسہ نہیں رہتا تھا۔ جب وہ قابل اعتبار نہیں رہا تھا تو پھر اس کی فراہم کردہ اطلاع کو کیوں معتبر سمجھا اور جانا جا سکتا تھا۔

میرا ذہن کئی زاویوں پر بیک وقت سوچتے ہوئے خاصا الجھ سا گیا تھا اور اس الجھن کو ایک ہی شخص دور کر سکتا تھا اور وہ تھا کانسٹیبل نوازش...... میں بڑی بے تابی سے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

جب مزید ایک گھنٹے تک بھی نوازش تھانے پہنچا اور نہ ہی نازلی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کی کسی نے ادھر کا رخ کیا تو میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف آ گیا۔ مذکورہ کوارٹر تھانے کی عمارت کے پچھواڑے واقع تھا۔

نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ کانسٹیبل باسط نے جما کی چال کے بارے میں جو فتویٰ جاری کیا تھا وہ بے وزن نہیں تھا۔



میں نے حسب معمول مغرب کی نماز کے بعد رات کا کھانا کھایا اور برآمدے میں بستر لگا کر لیٹ گیا۔ موسم ایسا تھا کہ کمرے کے اندر سویا جا سکتا تھا اور نہ ہی کوارٹر کے صحن میں لیٹنا ممکن تھا۔ کمرے میں گھٹن' گرمی اور مچھر تھے جبکہ صحن میں بارش برس رہی تھی لہٰذا آج کل اکثر راتیں برآمدے ہی میں گزر رہی تھیں۔

میں خود تو کوارٹر کے برآمدے میں لیٹا ہوا تھا اور ذہن جمال دین عرف جما کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ اگر کانسٹیبل باسط کی آنکھوں کو کوئی دھوکہ نہیں ہوا تھا تو پھر جما کی تھانے میں آمد بڑی تشویشناک تھی۔ اس نے مجھے سخاوت کوچوان کی بیٹی نازلی کی گمشدگی کی اطلاع دی تھی لیکن سخاوت علی کی جانب سے کوئی بھی شخص اس واقعہ کی رپورٹ درج کرانے نہیں آیا تھا۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ جما نے اس کوتاہی کا جو جواز پیش کیا تھا وہ میرے لئے قابل قبول نہیں تھا۔

ان لمحات میں' میں ان خطوط پر بھی سوچ رہا تھا کہ اگر سخاوت کو جوان کی بیٹی نازلی گھر سے غائب نہیں ہوئی تھی تو پھر کہیں جما مجھے غلط معلومات فراہم کر کے اپنا کوئی پوشیدہ مقصد تو حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کانسٹیبل باسط کے حیرت انگیز انکشاف نے جما کی ذات کو شک کی دبیز چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سامنے ہوتا تو میں اس یک چشم' ڈیڑھ ٹانگ شخص سے اپنے مطلب کی بات چٹکی بجاتے میں اگلوا لیتا۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کوارٹر کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ میں نے لیٹے لیٹے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ بارش کا سلسلہ وقتی طور پر رک گیا تھا تاہم ہلکی پھلکی بونداباندی جاری تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ سخاوت کی طرف سے نازلی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کوئی تھانے پہنچا ہوگا جبھی کوئی کانسٹیبل میرے دروازے کو کھٹکھٹانے آگیا تھا۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور جب تک صحن کو عبور کر کے میں بیرونی دروازے تک پہنچا' دستک کی آواز ایک مرتبہ پھر ابھری تھی۔ تیسری دستک سے پہلے ہی میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دروازہ کھولنے سے قبل میں نے حسب عادت پوچھ لیا۔

''کون ہے بھئی......؟''

''میں ہوں جی...... نوازش۔'' دوسری جانب کانسٹیبل نوازش کی جانی پہچانی آواز ابھری۔ ''میں جانتا ہوں' آپ ابھی تک سوئے نہیں ہوں گے اسی لئے ادھر آگیا ہوں ورنہ کبھی زحمت نہ دیتا......''

نوازش کا اندازہ صد فیصد درست تھا۔ میں عموماً عشاء کی نماز کی ادائیگی کے بعد ہی سونے کیلئے لیٹا کرتا تھا اور ابھی عشاء کی اذان بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے کانسٹیبل نوازش کھڑا تھا۔ میں نے اسے راستہ دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اندر آجاؤ۔''

''باسط نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ آپ مجھے یاد کر رہے تھے......'' وہ کوارٹر کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں معذرت چاہتا ہوں ملک صاحب...... آج مجھے ڈیوٹی پر آنے میں کافی دیر ہوگئی ہے۔''

اس کے بعد وہ مجھے بتانے لگا کہ اس تاخیر کا سبب کیا تھا۔ بارش نے اس کے گھر کی ایک دو چھتوں کے ساتھ خاصی گڑبڑ کر دی تھی اور وہ ان کے لیکیج کو روکنے میں ایسا مصروف تھا لہٰذا وقت پر تھانے نہ پہنچ سکا۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی۔ اس دوران میں ہم چلتے ہوئے برآمدے میں آگئے تھے جہاں میری چارپائی کے ساتھ ہی دو کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کرسی سنبھال لی اور دوسری پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد کہا۔

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے' میں واقعی تمہیں بڑی شدت کے ساتھ یاد کر رہا تھا۔''

''ملک صاحب! خیریت تو ہے نا......؟'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پریشانی سے بولا۔

''ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آگے کیا ہوگا اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''آپ تو مجھے ڈرا رہے ہیں جناب......!'' اس کی پریشانی دوچند ہوگئی۔ ''کچھ بتائیں تو سہی' آخر معاملہ کیا ہے؟''

''کچھ نہیں...... بلکہ میں پورا معاملہ ہی تمہارے سامنے کھول دیتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ باسط نے تمہیں کیا کہانی سنائی ہے؟''

''اس نے تو یہی بتایا ہے کہ آج شام میں ایک کانا اور لنگڑا گھڑسوار تھانے آیا تھا۔'' نوازش نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس شخص نے آپ سے میری کوئی شکایت کی ہے اسی لئے آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''یہ وہ کہانی ہے جو میں نے باسط کو ٹالنے کیلئے سنائی تھی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔''

''اور حقیقت کیا ہے ملک صاحب......؟'' اس کی پریشانی منزل بہ منزل عروج کی طرف جا رہی تھی۔ ''وہ گھڑسوار تھا کون...... میں تو کسی لنگڑے اور کانے شخص کو نہیں جانتا......''

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''نوازش! کیا تم ایمن آباد میں نہیں رہتے ہو؟''

''رہتا ہوں جی......!'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''پھر تم جما' جما جنج نال کو تو اچھی طرح جانتے ہو گے......؟''

میں ہر زاویے سے اطلاع فراہم کرنے والے جما کے بارے میں تسلی کر لینا چاہتا تھا اسی لئے غیر محسوس انداز میں نوازش کو ٹٹول رہا تھا۔ مجھے تو ایمن آباد کے علاقے میں تعینات ہوئے ابھی صرف ایک ماہ ہی ہوا تھا لہٰذا یہاں کے لوگوں کو جاننے اور پہچاننے کا دعویدار نہیں تھا' لیکن کانسٹیبل نوازش جدی پشتی ایمن آباد ہی کا رہنے والا تھا اس لئے یہاں کے بچے بچے اور بڑے بوڑھے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے جما کا ذکر کیا تو اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ بے حد الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں ملک صاحب! یہ جما جما جنج نال کیا شے ہے جناب......؟''

''کمال ہے......تم ایمن آباد میں رہتے ہو اور جمال دین عرف جما سے واقف نہیں ہو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''میں اس شخص کی بات کر رہا ہوں جس کی بائیں ٹانگ میں لنگ ہے اور وہ بائیں ہی آنکھ سے محروم بھی ہے۔ اس نے درمیانے سائز کی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی ہے۔ اس کے آٹھ سالہ بیٹے کا نام نصیر عرف بگو گوشہ ہے اور یہ جما ایمن آباد ہی میں کریانے کی دکان کرتا ہے۔''

''ملک صاحب! یا تو میں ابھی ابھی ایمن آباد میں پیدا ہوا ہوں اور یا پھر آپ میرا امتحان لینے کیلئے ایسے الٹے سیدھے سوال کر رہے ہیں۔'' وہ بیحد سنجیدہ لہجے میں بولا۔''میری معلومات اور یادداشت کے مطابق میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا بلکہ میں یہاں تک دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس حلیے' وضع قطع اور بیک وقت دو بنیادی جسمانی عیوب والا کوئی بندہ پورے ایمن آباد میں ہے ہی نہیں۔''

''اور اگر اس بندے کا ایک عیب کم کر دیا جائے تو......؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

کانسٹیبل باسط کی بات میرے ذہن میں لہرا کر گزر گئی تھی۔

''ایک عیب کم کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے ملک صاحب؟'' نوازش نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔''میں کچھ سمجھا نہیں جناب......!''

''مثلاً......ہم فرض کر لیتے ہیں کہ جما لنگڑا نہیں ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''بس اس کی ایک آنکھ نہیں' پھر تمہارا جواب کیا ہوگا؟''

لمحاتی تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا۔''میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ آپ جس بندے کا ذکر کر رہے ہیں وہ پورے ایمن آباد میں کہیں نہیں ہے۔'' وہ چند ثانیے کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''ہمارے علاقے میں صرف ایک ہی کانا شخص موجود ہے جس کا نام منظور ہے۔ اس کی ڈاڑھی بھی نہیں اور عمر بھی ساٹھ سال سے کچھ اوپر ہے۔ وہ پچھلے دو سال سے چارپائی سے لگا ہوا ہے۔ گھڑسواری تو دور کی بات' وہ تو چلنے پھرنے کے بھی قابل نہیں......''

''ہوں......!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔''تو اس کا مطلب ہے' مجھ سے ملاقات کرنے والا وہ جما کوئی فراڈ شخص تھا' وہ اپنے کسی خاص مقصد کی خاطر مجھے گمراہ کرنے یہاں آیا تھا۔''

''جناب! آپ مجھے اس بندے کے بارے میں تفصیل سے تو بتائیں......'' نوازش نے بے حد الجھن زدہ انداز میں کہا۔''اس کی آپ کے ساتھ کیا بات چیت ہوئی ہے......؟''

نوازش کے استفسار کے جواب میں' میں نے نہایت ہی جامع اور مختصر الفاظ میں اسے صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ میں خاموش ہوا تو وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! میں پورے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ جو کوئی بھی تھا بہت ہی دھوکے باز انسان تھا۔ اس نے ہر حوالے سے آپ کے ساتھ سراسر غلط بیانی کی ہے۔ سخاوت کوچوان میری گلی ہی میں رہتا ہے۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا تو مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میں یہاں سے جانے کے بعد گھر پر صرف چار گھنٹے سویا ہوں گا۔ میں دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے اٹھ گیا تھا۔ سخاوت کوچوان کی لڑکی نازلی کو تو میں نے سہ پہر میں خود اپنی آنکھوں سے گلی میں کھڑے دیکھا ہے۔ اگر وہ آج صبح سے گھر سے غائب ہو گئی ہوتی تو پھر کیسے نظر آتی۔''

نوازش کی گواہی نے اس معاملے کو روز روشن کے مانند عیاں کر دیا تھا۔ اب اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ جما نامی وہ کانا سراسر دروغ گو اور فراڈ شخص تھا' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے یہ حرکت آخر کی ہی کیوں؟''

اس کا یہ عمل ہنسی مذاق کے خانے میں تو فٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی شخص اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ تھانے میں آ کر خوامخواہ تو اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر جما نے یہ سب

کیا تھا تو پھر اس عمل کے پیچھے اس کا کون سا مقصد پوشیدہ تھا' اس بات کا پتا چلانا بہت ضروری تھا۔

''جناب! مجھے تو وہ آدمی کوئی بہت ہی چالاک مجرم محسوس ہو رہا ہے۔'' نوازش نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی عام شریف انسان تو اس قسم کی حرکت کی ہمت ہرگز نہیں کرسکتا۔ اس کے پیچھے اس کی کوئی گہری چال بھی ہوسکتی ہے۔''

''بھئی ہوسکتی ہے..... نہیں' بلکہ یقیناً اس عمل کے پیچھے اس کا کوئی خطرناک مقصد پوشیدہ ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور ہمیں جلد از جلد اس کے مقصد تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔''

''وہ کیسے ملک صاحب.....؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ ایسے کہ.....!''

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں' میرے اور کانسٹیبل نوازش کے درمیان جمال دین عرف جما کے عزائم اور مقاصد کے حوالے سے خاصی سنجیدہ گفتگو ہوئی اور یہ طے پا گیا کہ اگلی صبح کو ہم اس شخص کو ڈھونڈ نکالنے کیلئے کیا لائحہ عمل اختیار کریں گے۔

وہ شخص لنگڑا تھا یا نہیں اور اس کا نام بھی جما ہی تھا یا کچھ اور..... یہ بات اتنی اہم نہیں تھی۔ میرے لئے سب سے زیادہ قابل توجہ امر یہ تھا کہ اس نے یہ سارا ڈرامہ آخر کس مقصد کے حصول کیلئے رچایا تھا.....؟

اس کا مقصد جو بھی تھا لیکن مجھے قوی یقین تھا کہ میں بہت جلد اس کے عزائم کی تہ تک پہنچ جاؤں گا۔ اگر یہ حرکت اس کا کوئی مذاق تھا تو یہ مذاق اسے بہت مہنگا پڑنے والا تھا اور..... اگر یہ مذاق نہیں تھا تو پھر بھی کسی صورت اس کی اب خیر نہیں تھی۔ جلد یا بہ دیر' میں اسے ڈھونڈ نکالتا' پھر اس کا جو بھی حشر ہوتا' وہ پورا ایمن آباد دیکھتا۔



اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز تھی۔

میں رات کو کانسٹیبل نوازش کے جانے کے بعد کافی دیر تک اس ایک آنکھ اور ڈیڑھ ٹانگ والے دھوکے باز جما' جمانج نال کے بارے میں سوچتا رہا تھا' اس لئے صبح آنکھ تھوڑی تاخیر سے کھلی تھی۔ میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور تیار ہوکر تھانے پہنچ گیا' جہاں ایک نیا ہنگامہ میرا منتظر تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ نوازش میرے پاس آ گیا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! سارا مسئلہ ہی حل ہوگیا.....''

''کون سا مسئلہ؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''وہی جناب..... اس لنگڑے اور کانے والا مسئلہ۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''اس نے اپنی کالی زبان سے آپ کو جو اطلاع دی تھی وہ حقیقت میں پیش آ چکا ہے۔''

''کیا مطلب.....!'' میں نے متذبذب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ سخاوت کی لڑکی غائب ہوگئی ہے.....؟''

''جی ہاں..... میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''سخاوت کوچوان اور اس کی گھر والی باہر برآمدے میں آئے بیٹھے ہیں۔''

میں ابھی برآمدے میں سے گزر کر جب اپنے کمرے کی جانب آ رہا تھا تو میں نے برآمدے میں بچھی چوبی بنچ پر ایک مرد اور عورت کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میں انہیں چہروں سے نہیں پہچانتا تھا۔ اب نوازش نے بتایا تو پتا چلا کہ وہ سخاوت علی اور اس کی بیوی بشریٰ تھے۔

''وہ نازلی کی گمشدگی کے بارے میں کیا بتا رہے ہیں؟'' میں نے کانسٹیبل سے سوال کیا۔

"میں انہیں آپ کے پاس لے کر آتا ہوں۔" نوازش نے کہا۔ "آپ ان کی زبانی ہی کہانی سنیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے...... لے آؤ انہیں اندر......" میں نے جلدی سے کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ دونوں میاں بیوی میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی پریشانی سے تو میں آگاہ ہو ہی چکا تھا پھر بھی میں نے یکے بعد دیگرے ان کے چہروں کا جائزہ لیا اور پوچھا۔

"جی بتائیں...... میں آپ لوگوں کیلئے کیا کرسکتا ہوں؟"

انہوں نے اضطراری نظروں سے باری باری ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے انداز میں ایک خاص قسم کی ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی' جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ تھانیدار کو کون سے مسئلے سے آگاہ کرنا ہے۔

میں نے ان کی مشکل کو آسان کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا آپ لوگ کسی قسم کی رپورٹ درج کرانے تھانے آئے ہیں؟"

"ہم بہت پریشان ہیں تھانیدار صاحب......!" مرد نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں سخاوت علی ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا' پھر اپنی ساتھی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ میری گھر والی بشریٰ ہے جناب......!"

"ٹھیک ہے...... آپ دونوں کا تعارف تو ہوگیا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب یہ بھی بتادیں کہ کون سی پریشانی آپ کو کھینچ کر تھانے لے آئی ہے؟"

"ہماری پریشانی نازلی کی وجہ سے ہے تھانیدار صاحب......" بشریٰ گلوگیر آواز میں بولی۔ "وہ رات سے کہیں غائب ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کہاں گئی۔ ہم اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جیسے پاگل ہوگئے ہیں۔"

"نازلی ہماری بیٹی ہے جناب!" بشریٰ کے خاموش ہوتے ہی سخاوت نے بتایا۔ "سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا ہے۔ ہم نے پورا ایمن آباد چھان مارا ہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ساری رات ہم نے جاگ کر گزاری ہے......"

"آپ کی بیٹی کی عمر کیا ہے؟" میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ان سردیوں میں وہ پورے بائیس سال کی ہوجائے گی جناب۔" بشریٰ نے بتایا۔

"آخری بار نازلی کو آپ لوگوں نے کب اور کہاں دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

جما کی اطلاع کے مطابق نازلی گزشتہ روز صبح گھر سے غائب ہوئی تھی۔ یہ اطلاع سراسر غلط تھی کیونکہ کانسٹیبل نوازش نے کل سہ پہر نازلی کو اپنی گلی میں کھڑے دیکھا تھا۔ نوازش اور سخاوت کوچوان ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ نازلی کے والدین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔

میرے سوال کے جواب میں سخاوت نے بتایا۔ "مغرب کی اذان کے وقت تو وہ گھر میں ہی تھی۔ جب میں مسجد کی طرف گیا تو اسے گھر کے اندر ہی دیکھا تھا اور جب واپس آیا تو وہ گھر میں موجود نہیں تھی۔"

"جب تم مغرب کی نماز کیلئے گھر سے نکلے تو اس وقت نازلی کے علاوہ اور کون کون گھر کے اندر موجود تھا؟" میں نے سخاوت کوچوان سے پوچھا۔

"بشریٰ تھی اور...... خالد تھا......" اس نے جواب دیا۔ "بشریٰ اور نازلی دونوں گھر کے اندر تھیں اور میرا چھوٹا بیٹا خالد باہر دروازے کے سامنے گلی میں کھیل رہا تھا۔ میں نے اسے گھر جانے کیلئے کہا۔ جب وہ دروازے سے اندر داخل ہوگیا تو میں مسجد کی طرف چلا گیا تھا۔"

جما مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے میرے پاس آیا تھا یعنی جب وہ تھانے میں بیٹھا مجھے نازلی کی گمشدگی کی کہانی سنا رہا تھا اس وقت نازلی اپنے گھر پر موجود تھی۔ اس سے فوری طور پر ایک بات ذہن میں آئی تھی کہ عین ممکن ہے نازلی کی گمشدگی میں اسی کانے جما کا ہاتھ ہو۔

"اور جب مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے واپس آئے تو نازلی گھر میں موجود نہیں تھی۔" میں نے دوبارہ سخاوت کوچوان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی مجھے یہی بتایا ہے نا......؟"

"جی تھانیدار صاحب!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہی حقیقت ہے جو میں نے بیان کی ہے......"

میں نے اپنا رخ بشریٰ کی طرف پھیرا اور سوال کیا۔ "اب تم مجھے بتاؤ کہ نازلی کہاں چلی گئی۔ سخاوت تو اسے گھر میں چھوڑ کر گیا تھا اور جب یہ واپس آیا تو وہ غائب تھی۔ اس

دوران میں تم تو گھر پر تھیں نا......؟‘‘

’’جی تھانیدار صاحب‘ میں گھر میں تھی۔‘‘ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ’’اس وقت بارش رک گئی تھی۔ وہ میرے پاس آئی اور کہا کہ دس منٹ کیلئے عارفہ کے گھر جا رہی ہے۔ ابھی واپس آ جائے گی اور...... وہ اب تک واپس نہیں آئی۔‘‘ بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز رندھ گئی۔

’’کیا تم لوگوں نے نازلی کو عارفہ کے گھر میں تلاش کیا؟‘‘ میں نے استفسار کیا۔ ’’اور یہ بھی بتائیں کہ عارفہ کون ہے......؟‘‘

بشریٰ کے مطابق عارفہ‘ صفیہ نامی ایک بیوہ کی بیٹی تھی۔ صفیہ کا گھر ان کی پچھلی گلی میں تھا۔ یہ تفصیل فراہم کرنے کے بعد بشریٰ نے بتایا۔

’’جی سب سے پہلے تو ہم نے وہیں دیکھا تھا لیکن نازلی وہاں نہیں تھی۔‘‘

’’عارفہ نے کیا بتایا......؟‘‘

’’عارفہ کا کہنا ہے کہ پندرہ بیس منٹ کے بعد نازلی اس کے گھر سے چلی گئی تھی۔‘‘ بشریٰ نے جواب دیا۔ ’’لیکن وہ ابھی تک اپنے گھر نہیں پہنچی تھانیدار صاحب......‘‘

’’کیا وہ پہلے بھی عارفہ کے گھر جاتی رہتی تھی؟‘‘

’’جی...... یہ کوئی نئی بات نہیں۔‘‘ سخاوت نے جواب دیا۔ ’’عارفہ اور نازلی آپس میں سہیلیاں ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی رہتی ہیں۔‘‘

’’نازلی مغرب کی اذان کے وقت عارفہ کے گھر گئی......‘‘ میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ ’’پندرہ بیس منٹ وہاں بیٹھی اور ان لوگوں کے بیان کے مطابق وہ اپنے گھر واپس آ گئی‘ لیکن آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ گھر نہیں پہنچی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟‘‘

’’جی ہاں‘ یہی صورتحال ہے۔‘‘ سخاوت نے کمزور سی آواز میں کہا۔

’’تم لوگوں نے نازلی کو کہاں کہاں تلاش کیا ہے؟‘‘

’’یہ پوچھیں کہ کہاں تلاش نہیں کیا......‘‘ وہ بولا۔ ’’ہم نے اسے پورے ایمن آباد میں ڈھونڈا ہے مگر وہ کہیں نہیں ملی۔‘‘

’’اور ایمن آباد کے باہر......؟‘‘ میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

’’باہر وہ کہاں جا سکتی ہے تھانیدار صاحب......!‘‘ سخاوت بے چارگی سے بولا۔

’’میرا مطلب ہے......‘‘ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ’’ایمن آباد سے باہر آپ لوگوں کے رشتے دار وغیرہ تو ہوں گے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی رشتے دار کے گھر چلی گئی ہو؟‘‘

یہ سوال میں نے محض خانہ پری کیلئے کیا تھا تاکہ اس امکانی گوشے پر بھی کچھ روشنی پڑ جائے ورنہ اس بات کے امکانات تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ میری توقع کے عین مطابق بشریٰ نے جواب دیا۔

’’اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانیدار صاحب۔‘‘ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ’’آج تک وہ اکیلی کہیں نہیں گئی۔ اگر اسے ایمن آباد سے باہر کہیں جانا بھی تھا تو وہ ہمیں بتاتی۔ اس طرح چپ چاپ خود ہی منہ اٹھا کر وہ کہیں نہیں جا سکتی۔‘‘ وہ لمحے بھر کیلئے متوقف ہوئی‘ پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

’’مجھے تو جناب...... یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔‘‘

’’تمہارے ذہن میں کیا ہے؟‘‘ میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے بشریٰ کی طرف دیکھا۔

’’کسی نے اغوا......!‘‘ وہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔

’’ہم اس پہلو پر بھی بات کریں گے۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’پہلے آپ لوگ مجھے اس بات کا جواب دیں کہ ایمن آباد سے باہر آپ کے رشتے دار اور کہاں کہاں رہتے ہیں؟‘‘

’’بشریٰ کا تو کوئی رشتے دار اس دنیا میں ہے نہیں تھانیدار صاحب۔‘‘ سخاوت کوچوان نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ’’اور میرا بھی صرف ایک بڑا بھائی اور ایک چھوٹی بہن ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں......‘‘

’’کیا تمہارے یہ بھائی بہن ادھر ایمن آباد ہی میں رہتے ہیں؟‘‘

’’نہیں جی......‘‘ سخاوت نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ’’بھائی امانت علی تو موضع ہندو چک میں رہتا ہے اور میری چھوٹی بہن زینت ادھر کاموکی میں رہتی ہے۔‘‘

’’ہندو چک‘‘ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا‘ جو ایمن آباد کے تقریباً شمال مشرق میں واقع تھا جبکہ کاموکی نامی قصبہ ایمن آباد کے جنوب میں واقع تھا۔ اگر گوجرانوالہ سے لاہور کی طرف سفر کریں تو اپر چناب نہر عبور کرنے کے بعد قصبہ ایمن آباد آتا تھا۔ اس کے بعد کاموکی‘ پھر

مریدکے' شاہدرہ اور دریائے راوی عبور کرنے کے بعد لاہور۔ ایمن آباد' کامونکی' مریدکے' شاہدرہ...... سب جی ٹی روڈ پر واقع تھے۔ کامونکی اور مریدکے کی غلہ منڈیاں بہت مشہور تھیں۔

''ہاں بھئی بشریٰ......!'' میں نے گمشدہ نازلی کی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے خیال میں نازلی ہندو چک کی طرف گئی ہے اور نہ ہی اس نے کامونکی کا رخ کیا ہے بلکہ تم اس رخ پر سوچ رہی ہو کہ شاید اسے کسی نے اغوا کرلیا ہے...... ہیں نا؟''

''جج...... جی!'' اس نے اثباتی انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

میں ان میاں بیوی سے گفتگو کے دوران میں اہم پوائنٹس ایک کاغذ پر نوٹ بھی کرتا جا رہا تھا۔ بشریٰ کے جواب پر میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جب کوئی شخص اچانک منظر سے غائب ہوجاتا ہے اور ڈھونڈنے پر دستیاب نہیں ہوتا تو ذہن اس کے اغوا یا قتل کی طرف جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کا کام کوئی سجن دوست نہیں کرسکتا بلکہ یہ کسی دشمن کی کارروائی سمجھی جاتی ہے۔ اب آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا دشمن کون ہوسکتا ہے......؟''

''دشمن......!'' سخاوت نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''ہمارا تو کوئی بھی دشمن نہیں ہے تھانیدار صاحب......''

''اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دے رہے ہیں نا؟''

''جی ہاں...... بالکل......'' سخاوت نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں تو ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا جو دشمنی نکالنے کیلئے نازلی کو اغوا کرلے......''

''جمال دین کا نام سنا ہے تم لوگوں نے؟'' میں نے اہتمام حجت ضروری جانا۔

''جمال دین......!'' دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا اور وہ متذبذب نظروں سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ میں نے ان کی مشکل آسان کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میں اس جمال دین کی بات کررہا ہوں جس کی ایک ٹانگ میں لنگ ہے اور وہ ایک آنکھ سے کانا ہے۔ اس نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے اور لوگ اسے جما کہتے ہیں اور...... بعض تو اسے چھیڑنے کیلئے 'جما' جما جنج نال' بھی کہہ کر پکارتے ہیں......؟''

''یہ کون بندہ ہے جناب؟'' سخاوت کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''میں تو ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔''

''اور تم......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے بشریٰ کی جانب دیکھا۔

اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی اور بولی۔ ''نہیں جی...... میں نے اس قسم کے بندے کو کبھی نہیں دیکھا۔''

ان میاں بیوی کے واضح جوابات سے یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جو شخص جما کی حیثیت میں' گزشتہ شام مجھ سے ملنے تھانے آیا تھا' یہ لوگ اسے بالکل نہیں جانتے تھے۔ نہ دوست کے طور پر اور نہ ہی کسی دشمن کے رنگ میں۔ میں نے سوچا اس جما کی ہسٹری تو میں بعد میں معلوم کروں گا پہلے ذرا فریادیوں کی دادرسی کرلوں۔

''آپ دونوں کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نازلی کی گمشدگی میں کسی کا ہاتھ نہیں بلکہ وہ خود اپنی مرضی سے غائب ہوئی ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب؟'' سخاوت کے لہجے میں احتجاج تھا۔

بشریٰ بھی بے یقینی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاسکتی جناب۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

''اگر پہلے کبھی کچھ نہ ہوا ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آئندہ کبھی ویسا نہیں ہوسکے گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا' پھر باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا نازلی کی شادی ہوچکی تھی؟''

کانسٹیبل نوازش کی زبانی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ نازلی کنواری تھی تاہم میں نے یہ سوال کارروائی کی ضرورت کے پیش نظر کیا تھا۔ سخاوت علی نے جواب دیا۔

''نہیں جناب...... وہ غیرشادی شدہ ہے۔''

''کوئی منگنی وغیرہ ہوئی ہو؟''

''نہ منگنی اور نہ ہی شادی......'' اس بار بشریٰ نے جواب دیا۔ ''اس کے کئی رشتے تو آئے ہوئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ہم نے......''

''میں تو بہت پہلے اس بات کا فیصلہ کرچکا ہوں تھانیدار صاحب!'' سخاوت علی نے ٹھوس

لہجے میں کہا۔ ''لیکن میری بات بشریٰ کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''بات ڈھنگ کی ہوگی تو سمجھ میں آئے گی نا......'' بشریٰ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

''پورے چار سال کا فرق ہے دونوں کی عمروں میں۔''

''اللہ کی بندی! چار سال کا فرق بھی بھلا کوئی فرق ہوتا ہے۔'' سخاوت علی نے شاکی نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ''اپنا پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔''

''یہ تم لوگوں نے کون سی نئی کہانی شروع کر دی ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''نازلی کی گمشدگی کا ان باتوں سے کیا تعلق واسطہ ہے؟''

''ٹھہریں جی' میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' سخاوت جلدی سے بولا۔

''میں تو تمہارے کہنے پر تھوڑی دیر کیلئے ٹھہر جاؤں گا لیکن وقت کو ٹھہرانا ممکن نہیں جو کہ بہت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔'' میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''تمہیں جو کچھ بھی بتانا ہے' جلدی سے چار لفظوں میں بتا ڈالو۔''

''اچھا جی......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور شروع ہو گیا۔

سخاوت علی کوچوان کے مطابق وہ نازلی کی شادی اپنے بڑے بھائی امانت علی کے بیٹے سرفراز سے کرنے کا خواہشمند تھا لیکن بشریٰ اس رشتے کیلئے تیار نہیں تھی۔ اس کا سب سے بڑا اعتراض سرفراز کی عمر پر تھا۔ اس وقت نازلی بائیس سال کی اور سرفراز اٹھارہ سال کا تھا۔ بشریٰ کا مؤقف یہ تھا کہ شوہر کو بیوی سے دو چار سال بڑا ہونا چاہئے تا کہ بیوی شوہر سے بڑی ہو۔ دوسری جانب خرابی والی بات یہ تھی کہ ان کے رشتے داروں میں سرفراز کے سوا اور کوئی لڑکا تھا نہیں جس سے نازلی کی شادی کی جاتی۔ امانت علی کے بڑے تمام بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی اور کاموکی والی سخاوت علی کی چھوٹی بہن زینت کے آگے صرف لڑکیاں تھیں۔ زینت کی چار بیٹیاں تھیں لہٰذا خاندان کے اندر نازلی کی شادی سرفراز ہی سے ممکن تھی اور خاندان سے باہر شادی کیلئے سخاوت علی تیار نہیں تھا۔

''یہ جھگڑا تو بعد میں نمٹایا جا سکتا ہے کہ نازلی اور سرفراز کی جوڑی مناسب رہے گی یا نہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ مجھے یہ بتائیں کہ نازلی کا سرفراز کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہ تو جی سرفراز کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہے۔'' بشریٰ نے جلدی سے کہا۔ ''اس نے کبھی

اس حوالے سے تو سوچا ہی نہیں کہ سرفراز سے اس کی شادی بھی ہو سکتی ہے۔''

''اور نازلی کیلئے جو رشتے آئے ہوئے ہیں......!'' میں نے سوالیہ نظروں سے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ ''کیا وہ یہیں ایمن آباد ہی کے رہنے والے ہیں؟''

''جی ہاں......'' سخاوت علی نے جواب دیا۔

''ان لڑکوں کے بارے میں نازلی کی کیا رائے تھی؟''

''اس نے بتایا نہیں جی......'' بشریٰ نے کہا۔ ''ہم نے اس حوالے سے نازلی سے پوچھا نہیں تھا۔''

''ہوں......!'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''آپ لوگوں سے ایک بہت ہی نازک سا سوال پوچھ رہا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا ہوگا۔ کسی قسم کی غلط بیانی سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔''

''نہیں جناب' ہم آپ سے بالکل جھوٹ نہیں بولیں گے۔'' سخاوت علی نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''آپ پوچھیں' کیا پوچھنا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا نازلی کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی؟''

میرے اس سوال پر ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا' پھر بیک زبان بولے۔ ''نہیں جی......ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''اچھا!'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے ان کے چہروں پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا' پھر پوچھا۔ ''اور کوئی لڑکا اسے پسند کرتا ہو؟''

''تھانیدار صاحب! ہماری نازلی کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا'' سخاوت نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''آپ کو اگر ہماری بات کا یقین نہ ہو تو اپنے کانسٹیبل نوازش سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ وہ ہماری گلی میں ہی رہتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو نوازش اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔''

''ٹھیک ہے' میں نوازش سے ضرور اس معاملے کی تصدیق کروں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ اب اپنے گھر جاؤ۔ میں تفتیش کیلئے تھوڑی دیر میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔ مجھے نازلی کی سہیلی عارفہ سے بھی پوچھ گچھ کرنا ہے۔''

انہوں نے اطمینان سے گردن ہلائی اور مجھے سلام کر کے رخصت ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل نوازش کو اپنے پاس بلا لیا۔ جب بشریٰ اور سخاوت علی میرے کمرے میں آئے تھے تو میں نے نوازش کو باہر جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے ان میاں بیوی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور آخر میں سوال کیا۔

''اب بتاؤ' تم کیا کہتے ہو بیچ اس مسئلے کے۔ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں؟''

''مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے ملک صاحب ...!'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ''نازلی کی گمشدگی میں اسی خبیث کانے کا ہاتھ ہے جس نے آپ کو اپنا نام جما بتایا تھا۔''

''سارے اشارے تو اسی کی طرف جا رہے ہیں'' میں نے گھمبیر انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی کہ کوئی مجرم اتنا ہمت والا بھی ہو سکتا ہے کہ شام میں تھانے آ کر مجھے نازلی کی گمشدگی کی اطلاع بھی دے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ نازلی کو اغوا بھی کر کے لے جائے؟''

''آپ اسے دوسرے زاویے سے دیکھیں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''کون سا دوسرا زاویہ؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اس نے بتایا۔ ''وہ کانا بہادر یا ہمت والا تھا یا نہیں' ہم اس بحث میں نہیں پڑتے اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ایک چالاک اور ہوشیار مجرم تھا اور اس واردات میں کوئی اس کا شریک کار بھی رہا تھا۔'' وہ لمحے بھر کیلئے سانس لینے کو رکا تو میں نے اسے روکنا یا ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''وہ تھانے میں بیٹھ کر آپ کو نازلی کی گمشدگی کی کہانی سناتا رہا اور دوسری طرف اس کے ساتھ نے اپنا کام دکھا دیا ہوگا۔ پھر دونوں طے شدہ پروگرام کے مطابق کہیں ملے ہوں گے اور اپنی منزل کی جانب بڑھ گئے ہوں۔''

''تمہاری اس تھیوری میں اچھا خاصا کرنٹ تو ہے۔'' میں نے سوچتی ہوئی نظر سے نوازش کی طرف دیکھا۔ ''لیکن اب تک جو حالات و واقعات سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ نازلی کو اغوا نہیں کیا گیا بلکہ وہ جہاں بھی گئی ہے اور جس کے ساتھ بھی گئی ہے اس میں اس کی مرضی بھی شامل تھی......'' میں نے لحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب کسی شخص کو اغوا کیا جاتا ہے تو اس کارروائی کے نشانات بھی ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ اس عمل میں مغوی کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اٹھا لئے جانے کے خلاف کم یا زیادہ مزاحمت ضرور کرتا ہے۔ یقیناً اغوا کی صورت میں نازلی کو بھی اسی رویے کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا لیکن ایسے شواہد کہیں بھی نہیں ملے۔ وہ اپنی سہیلی سے ملنے پچھلی گلی میں گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔''

نوازش کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! وہ کون سی سہیلی کے گھر گئی تھی؟''

''انہوں نے اس سہیلی کا نام عارفہ بتایا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''عارفہ کا گھر پچھلی گلی میں ہے۔ وہ کسی بیوہ کی بیٹی ہے۔''

''ہاں' ہاں..... میں اچھی طرح جانتا ہوں جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''صفیہ نامی وہ عورت مطلقہ اور بیوہ ہے۔''

''مطلقہ اور بیوہ؟ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''وہ بات دراصل ہے ملک صاحب......!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''صفیہ نے کوئی سولہ سترہ سال پہلے رحمان نامی ایک زمیندار سے شادی کی تھی جو پھلی والا میں رہتا تھا' عارفہ اسی رحمان کی اولاد ہے۔ شادی کے دو سال بعد ہی صفیہ کو طلاق ہو گئی اور وہ پھلی والا سے واپس ایمن آباد آ گئی۔ چند سال بعد اس نے خاور نامی ایک بندے سے شادی کر لی جس سے اس کا ایک بیٹا انور ہے۔ خاور کا تعلق ایمن آباد ہی سے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے خاور کا انتقال ہو گیا اور اب صفیہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ میری پچھلی گلی میں رہتی ہے۔''

''ہوں......'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''صفیہ کا بیٹا انور تو ابھی چھوٹا ہی ہوگا؟''

''جی' وہ سات آٹھ سال کا ہے۔''

''پھر ان لوگوں کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''خاور مرتے وقت ان کیلئے ایک دکان اور آٹھ ایکڑ زمین چھوڑ گیا تھا۔'' نوازش نے بتایا۔ ''اس آٹھ ایکڑ اراضی کو صفیہ نے ٹھیکے پر دے رکھا ہے جہاں سے حاصل ہونے والے اناج اور آمدنی سے ان کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ پھر رہائش کیلئے ذاتی گھر ہے' اس لئے زیادہ

مسائل نہیں ہیں ان لوگوں کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے' میں باسط کو اپنے ساتھ لے کر سخاوت کوچوان کے گھر جا رہا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تم اس مشن پر روانہ ہو جاؤ جس کے حوالے سے ہم نے رات میں گفتگو کی تھی......" میں نے لمحاتی توقف کر کے دروازے سے باہر دیکھا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ آج بارش کو ابھی تک برسنا یاد نہیں آیا' اس لئے زیادہ سے زیادہ کام نمٹا لینا چاہئے۔"

"جی ملک صاحب! یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر ابھی تک بارش شروع نہیں ہوئی تو یہ سوچ کر مطمئن نہیں ہونا چاہئے کہ آج بارش ہوگی ہی نہیں۔ آسمان کی شکل رونے والی بنی ہوئی ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے جناب......"

"بس تو پھر تم روانہ ہو جاؤ۔" میں نے حتمی انداز میں کہا۔ "اور میں بھی نکل رہا ہوں۔"

ہمارے درمیان' رات والی میٹنگ میں یہ طے ہو گیا تھا کہ آج صبح نوازش گھوم پھر کر کانے گھڑسوار کے بارے میں معلومات جمع کرے گا۔ اس بات میں تو اب کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ یک چشم لنگڑا گھڑسوار ایمن آباد سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ وہ برستی بارش میں جب مجھ سے ملنے آیا تھا اور مجھ سے مل کر جب وہ واپس گیا تھا تو یقینی طور پر کچھ لوگوں نے اسے آتے اور جاتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ کانسٹیبل باسط کے دعوے کے مطابق وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جی ٹی روڈ کی جانب گیا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ جی ٹی روڈ پر چڑھنے کے بعد لاہور کی سمت گیا تھا یا اس نے گوجرانوالہ کا رخ کیا تھا۔ گوجرانوالہ' ایمن آباد کے شمال میں اور لاہور جنوب میں واقع تھا۔

کانے جما کے بارے میں تحقیق کی ذمہ داری میں نے نوازش کو سونپی تھی۔



سخاوت علی کوچوان کا گھر درمیانے سائز کا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس گھر کا تنقیدی جائزہ لے لیا تھا۔ وہ تین کمروں اور صحن پر مشتمل ایک روایتی سا دیہاتی مکان تھا۔ دو کمرے پہلو بہ پہلو مکان کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے تھے جبکہ تیسرا کمرہ بیٹھک کے طور پر

استعمال ہوتا تھا اور یہ گھر کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی سامنے والے حصے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ باورچی خانہ اور غسل خانہ ایک قطار میں بنے ہوئے تھے اور اسی دیوار کے آخری سرے پر چھپر کے نیچے ایک کنڈلی رکھی نظر آ رہی تھی۔ اس چھپر اور کنڈلی کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ سخاوت کوچوان بوقت ضرورت اپنے گھوڑے کو اس چھپر کے نیچے باندھتا ہوگا۔

میں نے سخاوت اور بشریٰ کی رہنمائی میں گھر کا معائنہ کر لیا تو مجھے پتا چلا کہ عقبی دونوں کمروں میں سے ایک میں تو بشریٰ اور سخاوت نے رہائش اختیار کر رکھی تھی جبکہ اس کے برابر والے کمرے میں نازلی اور خالد کا بسیرا تھا۔ خالد کی عمر لگ بھگ دس سال رہی ہوگی۔ ان دونوں بھائی بہن میں صبح وشام "تو تو' میں میں" بھی ہوتی رہتی تھی اور وہ مل کر ایک ساتھ بھی رہتے تھے۔ نازلی کی گمشدگی نے خالد کو اداس کر دیا تھا۔

بیٹھک میں کسی نے ڈیرا نہیں ڈال رکھا تھا۔ وہ مہمانوں کو بٹھانے اور خاطر تواضع کرنے کے استعمال میں آتی تھی۔ رسمی بات چیت اور پوچھ گچھ کے بعد میں نے سخاوت سے کہا۔

"میں اس کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جہاں نازلی کا سامان رکھا ہوا ہے۔"

"سامان کیا ہے جی......" بشریٰ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ایک سوٹ کیس ہے جناب جس میں وہ اپنے کپڑے وغیرہ رکھتی ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں وہی سوٹ کیس دیکھ لیتا ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

جب سے میرے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوا تھا کہ نازلی کی گمشدگی میں اس کی اپنی مرضی شامل ہے اسی لمحے سے میرے اندر رہ کر ایک آواز اٹھتی تھی اور وہ یہ کہ نازلی تک رسائی حاصل کرنے کیلئے' اس کے گھر کے اندر ہی سے کوئی سراغ ملے گا۔ اسی جستجو کے پیش نظر میں نے اس کا سامان دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں سخاوت کوچوان کی معیت میں نازلی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ ایک عام سا کمرہ تھا' چار دیواروں والا...... دو دیواروں کے ساتھ دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چارپائیاں یقیناً خالد اور نازلی کیلئے تھیں کیونکہ اس کمرے پر انہی دونوں کا قبضہ بتایا جاتا تھا۔ کمرے کی تیسری دیوار میں داخلی دروازہ بنا ہوا تھا جبکہ چوتھی دیوار کے ساتھ

ایک بڑی جستی پیٹی رکھی نظر آ رہی تھی۔ اس پیٹی کے اوپر دو تین صندوق بھی پڑے ہوئے تھے۔ جستی پیٹی یقیناً لحافوں اور گدوں وغیرہ کیلئے استعمال ہو رہی تھی اور صندوقوں میں کپڑے ہوں گے۔

سخاوت علی نے ایک سوٹ کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''تھانیدار صاحب! نازلی کا سامان اس بکسے کے اندر ہے۔''

مذکورہ سوٹ کیس ریگزین کا بنا ہوا تھا جس پر چیک دار رنگین پرنٹ تھا اور یہ سوٹ کیس، جستی صندوقوں کے پہلو میں، پیٹی کے اوپر رکھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت کمرے میں میرے اور سخاوت علی کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ بشریٰ بارش کے حوالے سے کسی گھریلو مسئلے میں الجھ گئی تھی کیونکہ باہر ایک مرتبہ پھر برسات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

میں نے سخاوت علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سخاوت! نازلی کے سامان والے سوٹ کیس کو نیچے تو اتارو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، گم ہو جانے والی لڑکی نے اس کے اندر کیا بھر رکھا ہے......؟''

اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور مذکورہ سوٹ کیس کو پیٹی کے اوپر سے اتار کر نازلی کے بستر پر رکھ دیا۔

''اسے کھولو......'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اور اس کے اندر موجود سامان کو ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کر دو۔''

وہ ایک بار پھر میرے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

سوٹ کیس کے اندر زیادہ تر نازلی کے پہننے والے کپڑے ہی رکھے نظر آ رہے تھے۔ سخاوت ایک ایک کپڑا نکال کر مجھے دیتا جا رہا تھا اور میں اس کپڑے کی تہیں کھول کر اور اچھی طرح جھٹک کر اپنی تسلی کرتا جا رہا تھا، پھر میں ''کلیئر'' کپڑے کو دوسری جانب رکھ دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سوٹ کیس خالی ہو گیا لیکن ایسی کوئی بھی اہم شے ہتھے نہ چڑھی جسے میں نازلی کی تلاش میں استعمال کر سکتا۔

سوٹ کیس کے ڈھکنے کی اندرونی جانب جو دو پاکٹ بنی ہوئی تھیں، میں نے انہیں بھی کھنگال ڈالا، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات......!

اچانک ایک برق رفتار خیال میرے ذہن سے گزرا اور میں بدست خود سوٹ کیس کے

ساتھ نبرد آزما ہو گیا۔

یہ خیال ان اخبارات کو دیکھ کر میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا جو سوٹ کیس کی تہ میں بچھائے گئے تھے۔ وہ گزری ہوئی تاریخوں کے پرانے اخبارات تھے۔ لوگ عموماً یہ حرکت کرتے ہیں کہ سوٹ کیس، درازوں اور شیلف وغیرہ میں کوئی چیز رکھنے سے پہلے نیچے اخبار وغیرہ بچھا دیتے ہیں۔ نازلی نے بھی اپنے سوٹ کیس میں کچھ ایسا ہی کر رکھا تھا۔ میں نے اضطراری انداز میں وہ اخبارات ہٹا کر دیکھا تو گوہر مقصود میرے ہاتھ لگ گیا۔

ان تہ شدہ بچھے ہوئے اخبارات کے نیچے سے دو اہم چیزیں برآمد ہوئیں جنہیں دیکھ کر میں نہ صرف چونک اٹھا بلکہ میرے رگ و پے میں سنسنی بھی دوڑ گئی تھی۔ ان دو سنسنی خیز اشیاء میں ایک تو تہ شدہ ریشمی رومال تھا اور دوسری چاندی کی ایک انگوٹھی تھی۔ چاندی کی اس زنانہ انگوٹھی میں سرخ رنگ کا ایک نگینہ بھی جڑا ہوا تھا جو کسی بھی قیمت پر یاقوت نہیں تھا۔ میری نظر میں وہ کانچ یا پلاسٹک کا ایک ٹکڑا تھا۔

میں نے تہ شدہ رومال کو کھول کر دیکھا تو اس کے اندر، موجودہ مسئلے کا حل مجھے صاف نظر آ گیا۔ مذکورہ رومال کے ایک کونے پر رنگین دھاگے کی مدد سے ایک خوبصورت پھول کاڑھا گیا تھا جبکہ دوسرے کونے میں دو دل پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ ایک دل کے اندر انگریزی حرف اے (A) اور دوسرے کے اندر (N) بھی کاڑھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دو دلوں کے اندر کڑھے ہوئے یہ A اور N کسی محبت کی کہانی کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ یہ رومال چونکہ نازلی کے سوٹ کیس کے اندر سے دستیاب ہوا تھا اور اسے بڑی احتیاط کے ساتھ چھپا کر رکھا گیا تھا لہٰذا میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ (N) کا مطلب تو نازلی ہے، اگر میں (A) نام والے کسی مرد کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ کیس چٹکی بجاتے میں حل ہو سکتا تھا۔ میرے فوری اندازے کے مطابق چاندی کی وہ انگوٹھی کسی (A) نے نازلی کو محبت کے تحفے کے طور پر دی تھی اور نازلی نے یہ ریشمی رومال اپنی محبت کی نشانی کے طور پر اسی (A) کیلئے کاڑھا تھا۔

میں نے یہ دونوں چیزیں سخاوت علی کو دکھائیں اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے سخاوت......؟''

میرے ساتھ ہی وہ بھی رومال اور انگوٹھی کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کے چہرے اور

آنکھوں میں بے پناہ تذبذب اور الجھن کے تاثرات نمودار ہوتے دیکھے۔ وہ بڑی ہمت کر کے کمزوری سی آواز میں بولا۔

’’تھانیدار صاحب...... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔‘‘

’’اس معاملے کو تو سمجھ رہے ہو نا؟‘‘ میں نے معنی خیز انداز میں ریشمی رومال والے دو دلوں پر انگلی رکھتے ہوئے سوال کیا۔

’’جی...... یہ تو...... صاف...... نظر آ رہا ہے......‘‘ ندامت کے بوجھ سے اس کی آواز کٹ کر رہ گئی تھی۔

’’جب میں نے پوچھا تھا کہ......‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’نازلی کسی لڑکے کو پسند تو نہیں کرتی تھی یا کوئی لڑکا اس میں دلچسپی تو نہیں لے رہا تھا تو آپ دونوں میاں بیوی نے صاف انکار کر دیا تھا...... ہیں نا؟‘‘

’’میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں جناب کہ نازلی کے اس معاملے کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔‘‘ وہ روہانسا ہو گیا‘ پھر شکستہ لہجے میں بولا۔ ’’ٹھہریں‘ میں بشریٰ کو بلا کر لاتا ہوں۔‘‘

سوٹ کیس میں سے برآمد ہونے والی اشیاء کو دیکھ کر سخاوت کے چہرے پر خفت اور ندامت کے جو تاثرات ابھرے تھے وہ ایک فطری ردعمل تھا۔ یہ انکشاف ہی اتنا سنسنی خیز اور خطرناک تھا کہ کسی بھی شریف النفس باپ کو شرمندگی کی دلدل میں دھنسانے کیلئے کافی تھا۔ میں سخاوت کی جذباتی کیفیت اور مجروح احساسات کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ ان لمحات میں اس نے کسی قسم کی اداکاری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ رویہ اس کے دلی جذبات کی سچی ترجمانی تھا۔ بیٹی کے خفیہ معاملے سے آگاہ ہونے کے بعد وہ یکا یک ایک بے بس‘ لاچار اور بوڑھا باپ نظر آنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی بیوی بشریٰ کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ اس دوران میں‘ میں نے چاندی کی انگوٹھی اور ریشمی رومال کا ہر پہلو سے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا‘ جب میں نے مختصر الفاظ میں بشریٰ کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا تو وہ جھٹ سے بولی۔

’’ایسا کیسے ہو سکتا ہے تھانیدار جی......‘‘

’’ہو سکتا نہیں بلکہ...... یہ ہو چکا ہے۔‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’سارے ثبوت تمہارے سامنے ہیں‘ تم اس حقیقت کو کیسے جھٹلا سکتی ہو......‘‘

’’پر جناب...... نازلی تو ایسی لڑکی نہیں تھی۔‘‘

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ’’وہ ایسی تھی یا نہیں‘ اب یہ اتنا اہم نہیں رہا۔ سوٹ کیس کی تہہ سے برآمد ہونے والے یہ واضح ثبوت اسے کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث ظاہر کرتے ہیں یا تو تم اپنی بیٹی کو سمجھ نہیں پائی ہو اور یا پھر تمہیں سب پتا ہے اور تم جان بوجھ کر نازلی کے اس معاملے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو۔‘‘

’’ایسی بات نہیں ہے جناب......‘‘ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ’’مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ کہیں گے تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔‘‘

’’تو تمہارے خیال میں یہ انگوٹھی اور رومال میں نے نازلی کے سوٹ کیس میں رکھا تھا......؟‘‘ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

’’میں نے یہ تو نہیں کہا جی......!‘‘ وہ بے چارگی سے مجھے تکنے لگی۔

اس دوران میں سخاوت علی خاموش کھڑا ہم دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو کو سن رہا تھا۔ اس کی نگاہ کبھی میرے چہرے پر اور کبھی بشریٰ کے چہرے پر ٹھہر جاتی تھی۔ موجودہ صورتحال نے گویا اسے گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔

میں نے مذکورہ ریشمی رومال کو بشریٰ کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’اس ’’این‘‘ کا تو سیدھا سیدھا مطلب ہے‘ نازلی اور باقی رہ گیا ’’اے‘‘...... مجھے اسی ’’اے‘‘ کی تلاش ہے......‘‘ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی‘ پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

’’کوئی ایسا لڑکا جس کا نام الف یا عین سے شروع ہوتا ہو۔ مجھے یقین ہے‘ یہ رومال اور انگوٹھی اسی لڑکے نے نازلی کو دیئے ہوں گے۔ ان دونوں کے بیچ محبت والی کہانی چل رہی تھی اور...... اور نازلی کی گمشدگی میں بھی اسی محبت کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔‘‘

’’لیکن تھانیدار صاحب! یہ بھی تو ممکن ہے کہ......‘‘ سخاوت علی کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ’’کیا ممکن ہے سخاوت علی؟‘‘

’’وہ جناب...... عارفہ کا نام بھی تو عین سے شروع ہوتا ہے۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ’’نازلی اور عارفہ بڑی پکی سہیلیاں ہیں اور ان میں بہت زیادہ

محبت بھی ہے، ممکن ہے یہ رومال عارفہ ہی نے نازلی کو تحفے میں دیا ہو۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے سخاوت علی!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ وزن اس قدر نہیں ہے کہ میری سوچ اس سے متاثر ہو جائے۔ بہر حال......" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہاں سے اٹھنے کے بعد عارفہ کے گھر جا رہا ہوں۔ میں اسے بھی چیک کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر یہ رومال اسی نے نازلی کو دیا تھا تو پتا چل جائے گا۔"

بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بشریٰ نے جلدی سے کہا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں جی......"

"اس کی ضرورت نہیں بشریٰ......!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ تم اپنے چھوٹے بیٹے کو میرے ساتھ بھیج دو...... رہنمائی کیلئے۔"

ان کے پاس میرے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا، چنانچہ بے بسی سے مجھے دیکھ کر رہ گئے۔ میں نازلی کے چھوٹے بھائی دس سالہ خالد کے ہمراہ عارفہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بارش کا سلسلہ ہنوز جاری و ساری تھا، تاہم فی الوقت یہ معاملہ محض بوندا باندی تک ہی محدود تھا۔ میں نے بشریٰ کو اپنے ساتھ لانے سے اس لئے منع کر دیا تھا کہ میں عارفہ سے بالکل علیحدگی میں پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ اگر بشریٰ اور سخاوت میں سے کوئی موجود ہوتا تو اس بات کا امکان بہر حال رہتا کہ عارفہ مجھے کھل کر کچھ بتا نہ پاتی۔ عارفہ کا گھر چونکہ پچھلی گلی ہی میں واقع تھا لہٰذا وہاں تک رسائی میں بمشکل تین منٹ لگے ہوں گے۔

جب خالد نے مطلوبہ مکان کی نشاندہی کر دی تو میں نے اسے بھی واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوتا تھا جس کیلئے مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر عارفہ کے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں عارفہ کی بیٹھک میں موجود تھا۔



کانسٹیبل نوازش نے مجھے عارفہ اور اس کے خاندان کے دیگر افراد کے بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں وہ من وعن درست ثابت ہوئیں۔ نازلی کی گمشدگی والا معاملہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہا تھا۔ میں نے ذاتی تعارف کے بعد جب عارفہ کی ماں صفیہ کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا تو وہ بڑی فکر مندی سے بولی۔

"تھانیدار صاحب! کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ نازلی کہاں غائب ہو گئی ہے۔ کل شام میں تو وہ یہاں سے بھلی چنگی گئی تھی۔"

"یہاں سے وہ بھلی چنگی رخصت ہوئی لیکن اپنے گھر نہیں پہنچی......" میں نے صفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک اس کے کہیں غائب ہو جانے کا تعلق ہے تو اس کا پتا ابھی لگا لیتا ہوں میں......" میں نے تھوڑا توقف کر کے معنی خیز انداز میں عارفہ کی طرف دیکھا، پھر اس سے سوال کیا۔

"کیوں عارفہ...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟"

"م...... مجھے...... کیا پتا جی......!" وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔

عارفہ کی عمر مجھے پندرہ سال کے قریب بتائی گئی تھی لیکن ماشاء اللہ اس نے صحت ایسی پائی تھی کہ اٹھارہ بیس کی نظر آتی تھی۔ اس کی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں کیا پتا نہیں عارفہ......؟"

"وہ جی...... میں یہ کہہ رہی تھی کہ......" وہ لڑکھڑاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے کیا پتا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یا غلط......!"

"ہوں......!" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں یہ سمجھا کہ

تمہیں اس بات کا پتا نہیں کہ نازلی کہاں غائب ہوئی ہے......؟''

''مجھے...... اس کا بھی کچھ پتا نہیں جی......!'' اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

''تھانیدار صاحب! آپ تو میری بچی کو اس طرح گھور رہے ہیں جیسے نازلی کو اسی نے کہیں گم کر دیا ہو۔'' صفیہ نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''اگر اس نے گم نہیں بھی کیا تو......'' میں نے صفیہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تو یہ کم از کم اتنا ضرور جانتی ہے کہ وہ کہاں غائب ہوئی ہے......؟''

میں نے حالات واقعات کے پیش نظر تفتیش کے اندھیرے میں اندازے کا ایک تیر چھوڑا تو صفیہ متعجب انداز میں مجھے دیکھنے لگی' پھر قدرے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''تھانیدار صاحب! اگر عارفہ کو اس بات کا پتا ہوتا تو وہ اب تک ضرور بتا چکی ہوتی۔ کل رات ہی سے نازلی کے ماں باپ اس قدر پریشان ہیں کہ بس' میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔''

''تم نہیں بھی بتاؤ تو مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ اب آپ لوگوں کے ساتھ ساتھ میں خود بھی بہت پریشان ہو چکا ہوں اور میری پریشانی اس وقت تک دور نہیں ہوگی جب تک میں الف یا عین سے شروع ہونے والے نامی بندے کو گرفتار نہیں کر لوں گا۔''

اس وقت میرے' عارفہ اور اس کی ماں صفیہ کے سوا بیٹھک میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ عارفہ کا چھوٹا بھائی انور پڑوسی بچوں کے ساتھ انہی کے گھر میں کھیل رہا تھا۔ صفیہ میری وضاحت پر بری طرح چونک اٹھی تھی۔

''یہ الف اور عین کا کیا چکر ہے تھانیدار صاحب......؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازلی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے......!''

ریشمی رومال اور چاندی کی انگوٹھی کی دستیابی کے بعد نازلی کی گمشدگی کے حوالے سے

میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازلی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

''لیکن تھانیدار جی......'' صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ''الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سینکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازلی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟''

''اس سلسلے میں تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا' پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''تم میری مدد کرو گی نا......؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نگل کر لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

''مم...... میں کیا...... مدد کر سکتی ہوں جی...... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں...... وہ کہاں گئی ہے......!''

''یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا......؟''

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق وہ نازلی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تھانیدار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازلی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو......؟''

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

ہاں صفیہ! ایسی ہی بات ہے۔ دو ثبوت میرے ہاتھ لگے ہیں۔ بس' عارفہ سے ان کی

تصدیق کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے، عارفہ اس بارے میں بہت کچھ جانتی ہوگی۔ یہ اس کی گہری اور رازدار سہیلی ہے...... اس کی محبت سے بھی بخوبی واقف ہوگی۔ عارفہ کے تعاون سے میرا کام آسان ہوجائے گا۔ اس کے بعد میں پہلی فرصت میں نازلی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''کون سے دو ثبوت؟'' صفیہ اور عارفہ نے بیک زبان پوچھا۔

میں نے سردست ان کے اس سنسنی خیز سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور براہ راست عارفہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ بات درست ہے کہ کل شام میں، مغرب کی اذان سے چند لمحے پہلے گمشدہ نازلی تم سے ملنے یہاں آئی تھی؟''

''جی ہاں، وہ آئی تھی......!'' عارفہ کے بجائے صفیہ نے تصدیقی انداز میں جواب دیا۔

''صفیہ بی بی!'' میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔''جب تک میں تم سے کوئی سوال نہ کروں تم بالکل خاموش بیٹھی رہوگی۔ میری بات سمجھ رہی ہونا......؟''

''جی چنگی طراں سمجھ گئی۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔''اب میں چپ رہوں گی تھانیدار صاحب......!''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔''تم ایک تجربہ کار اور بردبار عورت ہو۔ مجھے تم سے ایسی ہی عقل مندی کے مظاہرے کی توقع تھی۔''

صفیہ کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں عارفہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''تمہاری والدہ نے اس بات کی تصدیق تو کردی کہ گزشتہ شام نازلی تم سے ملنے کیلئے یہاں آئی تھی۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ کیا وہ خود ہی تمہارے گھر آئی تھی یا تم نے خاص طور پر اسے بلایا تھا؟''

اس سوال کا جواب مجھے پہلے سے معلوم تھا لیکن پھر بھی میں عارفہ کی زبان سے اس کی تصدیق یا تردید چاہتا تھا کیونکہ آگے آنے والے بیش تر سوالات کا دارومدار اسی تصدیق یا تردید پر تھا۔

عارفہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا''جی ہاں...... وہ میرے بلانے پر ہی یہاں آئی تھی۔''

''کیا تم نے اسے کسی خاص کام سے بلایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔''جی ہاں......!''

''کس کام سے؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

''وہ جی...... میں سرہانے کا غلاف کاڑھ رہی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''کوئی نیا ڈیزائن سمجھ میں نہیں آرہا تھا' سوچا کہ نازلی سے مشورہ کرلوں۔ میں نے اسی مقصد سے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔''

''تمہاری بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نازلی کو سلائی کڑھائی کا بڑا تجربہ تھا؟''

''جی ہاں' وہ امورخانہ داری کی بہت ماہر ہے۔''

لفظ''کڑھائی'' سے میرا ذہن فوراً اس ریشمی رومال کی جانب چلا گیا تھا جو گمشدہ نازلی کے سوٹ کیس میں سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے سخاوت علی کے گھر سے نکلتے وقت چاندی کی انگوٹھی اور ریشمی رومال اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

''عارفہ!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔''جو لوگ کسی بھی ہنر کے ماہر ہوتے ہیں ان کے کام کا اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے جو سینکڑوں ہزاروں لوگوں کے کاموں میں بالکل الگ پہچانا جاسکتا ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ٹٹولنے والی نظر سے عارفہ کو دیکھا' پھر سوال کیا۔

''کیا نازلی کی کڑھائی کا بھی اپنا ایک منفرد انداز ہے؟''

''جی ہاں...... بالکل ہے!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔''ہمارے محلے میں نازلی سے زیادہ صاف کڑھائی اور کوئی لڑکی کرہی نہیں سکتی۔''

''گویا تم نازلی کے ہاتھ کے کام کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان سکتی ہو؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے فی الحال سوالات کے زاویے کو تھوڑا سا تبدیل کردیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سچ سچ بتاؤ عارفہ! نازلی کا کس لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا؟''

''وہ جی......'' وہ بے حد گھبرا گئی۔''مجھے کچھ پتا نہیں......''

''اس کا مطلب ہے' شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' میں نے خاصے خطرناک انداز میں کہا۔''باقی کی پوچھ گچھ کیلئے تمہیں اپنے ساتھ تھانے لے کر جانا پڑے گا۔''

عارفہ سہمی ہوئی نظر سے اپنی ماں کو تکنے لگی۔ صفیہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''تھانیدار صاحب! آپ عارفہ کی صحت پر نہ جائیں۔ میری بچی بہت ہی حساس اور دل کی کمزور ہے۔ آپ کی خوفناک باتیں کہیں اس کے دماغ پر کوئی الٹا اثر نہ کردیں۔''

''مجھے تو کوئی شوق نہیں ہے اسے تھانے لے کر جانے کا۔'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''لیکن اگر یہ مجھ سے تعاون نہیں کرے گی تو پھر مجھے مجبوراً یہ قدم تو اٹھانا ہی پڑے گا۔''

''آپ کو کس بنا پر یقین ہے کہ نازلی کا کسی لڑکے سے کوئی چکر تھا۔'' صفیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''اور یہ کہ عارفہ ان کے چکر سے بھی واقف ہے......؟''

''میں نے تھوڑی دیر پہلے دو ٹھوس ثبوت ہاتھ لگنے کی بات کی تھی۔'' میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''انہی ثبوت کی بنا پر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ نازلی کسی ایسے لڑکے کی محبت میں گرفتار تھی جس کا نام الف یا عین سے شروع ہوتا ہے۔''

''سخاوت اور اس کی گھر والی نے اس سلسلے میں کیا بتایا ہے؟'' صفیہ نے ایک اہم سوال کیا۔

''انہوں نے اس معاملے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اسی لئے نازلی کی راز دار سہیلی سے معلومات حاصل کرنے میں یہاں پہنچا ہوں۔''

''کیا وہ دونوں ٹھوس ثبوت آپ مجھے دکھا سکتے ہیں؟'' صفیہ نے پوچھا۔

''بالکل دکھا سکتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں سے چاندی کی انگوٹھی نکال لی' پھر اسے صفیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے نازلی کے سوٹ کیس میں سے ملی ہے۔''

صفیہ نے مذکورہ انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں لے کر گھما پھرا کر دیکھا' پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو یہ انگوٹھی نازلی کے ہاتھ میں کبھی نظر نہیں آئی۔''

''خفیہ محبت کی نشانیوں کو استعمال میں نہیں لایا جاتا صفیہ بی بی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ محبت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔''

میرے اس تبصرے پر صفیہ نے سوالیہ نظر سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم نے کبھی اس انگوٹھی کو نازلی کے پاس دیکھا تھا......؟''

''آں......!'' وہ ہچکچا کر خاموش ہوگئی۔

''عارفہ!'' میں نے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''بالکل واضح جواب دو۔ ہاں یا نہ......؟''

''جی...... مجھے یاد آرہا ہے کہ...... نازلی نے ایک بار مجھے یہ انگوٹھی دکھائی تو تھی۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولی۔ ''لیکن اب یہ یاد نہیں کہ اس انگوٹھی کے حوالے سے اس نے مجھے بتایا کیا تھا۔''

عارفہ کا لہجہ اور انداز اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ دیدہ دانستہ اپنی سہیلی کے معاملے کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب میں اسے آسانی سے فرار کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

''یادداشت کو واپس لانے کا فارمولا بھی ہے میرے پاس......'' میں نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر تہ شدہ ریشمی رومال نکال لیا اور اسے عارفہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے کھول کر دیکھو۔''

''یہ کیا ہے جی؟'' اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں وہ تہ شدہ رومال میرے ہاتھ سے لے لیا۔

''کھول کر دیکھو گی تو پندرہواں طبق روشن ہوجائے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس میں دور دراز گئی ہوئی یادداشت کو واپس لانے کا فارمولا بند ہے۔''

صفیہ الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی اپنی بیٹی عارفہ کو دیکھ رہی تھی تاہم میری ہدایت کا خیال رکھتے ہوئے اس نے ہمارے بیچ کسی قسم کی مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔

عارفہ نے جیسے ہی ریشمی رومال کھول کر دیکھا' اسے ایک جھٹکا سا لگا' مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ اس سے پہلے بھی مذکورہ رومال کو دیکھ چکی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں اور چہرے پر شناسائی کے بڑے واضح آثار ابھرتے دیکھے تھے۔

''یادداشت واپس آگئی یا تھانے چلیں عارفہ......؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس رومال میں ہے کیا جی' ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔'' صفیہ کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

وہ ایک ایسے زاویے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ عارفہ کے ہاتھ میں موجود رومال کو پوری تفصیل کے ساتھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ تھانے کے ذکر پر اس کی پریشانی ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔

میں نے اس کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے عارفہ سے کہا۔ ''تم نازلی کے ہاتھ کی کڑھائی کو دیکھتے ہی پہچان لینے کی دعویدار ہو۔ اس رومال پر جو کام ہوا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے......؟'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد بڑے سنگین الفاظ میں اضافہ کیا۔

''عارفہ! میں تمہیں سچ بولنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو پھر سمجھ لو۔ میں سختی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

''جی...... میں نے پہچان لیا ہے۔'' وہ اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ کڑھائی نازلی ہی کے ہاتھ کی ہے۔''

''نازلی نے یہ رومال کس کیلئے کاڑھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہچکچا کر دائیں بائیں ہونے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''کوئی گڑبڑ نہیں عارفہ...... میں جانتا ہوں کہ تم نے اس کڑھائی ہی کو نہیں بلکہ رومال کو بھی پہچان لیا ہے...... تم اس رومال کو نازلی کے پاس پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟''

''جی......!'' وہ اقراری لہجے میں بولی۔ ''نازلی نے یہ رومال مجھے دکھایا تھا۔''

''اور وہ چاندی کی زنانہ انگوٹھی؟''

''وہ بھی......!''

''اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ چاندی کی انگوٹھی کس نے نازلی کو دی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اور نازلی نے یہ ریشمی رومال کس کو دینے کیلئے کاڑھا تھا؟''

صفیہ بڑی دیر سے الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اس کی تسلی کیلئے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ریشمی رومال اور چاندی کی انگوٹھی کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے دو دل اور انگریزی حرف (این) اور (اے) کی بھی وضاحت کر دی۔ اس نے میری بات پوری توجہ سے سنی اور میرے خاموش ہونے پر عارفہ کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولی۔

''عارفہ! تمہیں جو کچھ پتا ہے' صاف صاف تھانے دار جی کو بتا دو ورنہ یہ تو تمہیں بعد میں

تھانے لے کر جائیں گے' میں ابھی سے تمہیں کوٹنا شروع کردوں گا۔ اس بدبخت نازلی نے تمہیں کن چکروں میں ڈال رکھا ہے۔''

حقیقت حال سے واقفیت کے بعد صفیہ بڑے جلال میں آ گئی تھی اور اس کے اس رویے سے میرا کام خاصا آسان ہوگیا تھا۔ جب دونوں جانب سے چڑھائی دیکھی تو عارفہ کی ہمت جواب دے گئی اور اسے اقرار کرتے ہی بنی۔

''اس لڑکے کا نام اسلم ہے......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لیکن سب اسے ''بھولا'' کہتے ہیں۔

''بھولا!'' صفیہ نے الجھن زدہ نظر سے عارفہ کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون ہے۔ میں تو کسی اسلم یا بھولا کو نہیں جانتی؟''

عارفہ کے انکشاف کے بعد (اے) والا معاملہ تو بالکل صاف ہوگیا تھا۔ (این) سے نازلی اور (اے) سے اسلم...... لیکن ابھی بھی مجھے اس سے بہت ساری باتیں پوچھنا تھیں۔ اپنی ماں کے سوال کے جواب میں عارفہ نے بتایا۔

''بھولا کو میں نے بھی نہیں دیکھا' بس نازلی کی زبان ہی سے اس کا نام سنا ہے......''

میں نے عارفہ سے ایک اہم سوال کیا۔ ''اس اسلم عرف بھولا کو نہ تو تم نے دیکھا ہے اور نہ ہی تمہاری ماں اسے جانتی ہے۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بندہ ایمن آباد کا رہنے والا نہیں۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟''

''جی......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''بھولا ادھر کامونکی میں رہتا ہے۔''

''کامونکی'' کے نام پر میں چونک اٹھا۔ میری معلومات کے مطابق نازلی کی پھوپھی زینت کامونکی میں رہتی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں عارفہ سے پوچھا۔

''کامونکی میں کس جگہ......؟''

''جگہ کا تو مجھے پتا نہیں جناب......'' وہ متاملانہ انداز میں بولی۔ ''نازلی نے صرف اتنا بتایا تھا کہ بھولا اس کی کامونکی والی پھوپھی کے پڑوس میں رہتا ہے۔''

''تم کتنی گھنی ہو عارفہ......!'' صفیہ نے تیز نظر سے اپنی بیٹی کو گھورا۔ ''تم دونوں سہیلیاں اتنا خطرناک کھیل' کھیل رہی تھیں اور مجھے کوئی خبر بھی نہیں......؟''

''اس سے زیادہ گھنی تو وہ نازلی تھی۔'' میں نے صفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس

ے ماں باپ کو تو اس کے کرتوتوں کا کچھ پتا نہیں۔''

صفیہ نے تھانیدار بننے کی کوشش کرتے ہوئے عارفہ سے سوال کیا۔ ''نازلی اور بھولا کا چکر کب سے چل رہا تھا؟''

''مجھے ٹھیک طرح سے پتا نہیں۔'' وہ جواباً بولی۔ ''نازلی نے دو تین ماہ پہلے ہی مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔''

''کیا کل شام میں بھولا یہاں ایمن آباد............آیا تھا؟'' میں نے عارفہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔

''مجھے نہیں پتا جی......!'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ اس کے الفاظ اور انداز سے اعتماد جھلکتا تھا۔ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا اس نے ایسا کوئی ذکر کیا تھا کہ گزشتہ روز بھولا اس سے ملنے کیلئے ایمن آباد آنے والا ہے؟''

''نہیں جی' اس نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ بھولا کبھی یہاں آیا ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''جناب! جہاں تک میں جانتی ہوں یا نازلی نے مجھے جتنا بتایا ہے اس کے مطابق تو بھولا نازلی سے ملنے یہاں کبھی نہیں آیا۔ یہ جب اپنی پھوپھو کے پاس کامونکی جایا کرتی تھی تو وہاں ان کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔''

میں نے گھما پھرا کر اسی حوالے سے مزید دو چار سوالات کئے لیکن کوئی نیا یا زیادہ حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ نازلی کی حالیہ گمشدگی یا اپنی مرضی سے فرار کے بارے میں عارفہ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ جس حد تک مجھے معلومات فراہم کرسکتی تھی وہ اس نے کردی تھی۔ میں اس سے جو کچھ بھی اگلوانے میں کامیاب ہوسکا اس سے میری تفتیش کیلئے ایک واضح راہ متعین ہوگئی تھی۔ میں نے ان الفاظ کے ساتھ عارفہ کو فارغ کردیا۔

''دیکھو عارفہ! تم ایک اچھی اور سمجھدار لڑکی ہو۔ تم نے مجھے جو کچھ بھی بتایا ہے اس پر میں نے آنکھیں بند کرکے یقین کرلیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بعد میں ان میں سے کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوگی......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نہایت ہی

ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''میں تم سے یہ امید رکھ سکتا ہوں نا کہ تم نے مجھے سب کچھ سولہ آنے سچ بتایا ہے؟''

''جی ہاں...... میں نے آپ سے ایک ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو یقین نہیں آرہا تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو بھی تیار ہوں۔''

''قسم کھانے کی ضرورت نہیں' مجھے تمہاری بات کا ایسے ہی بڑا اعتبار ہے۔'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی قسم کھالینے سے چیزوں کی حقیقت تھوڑی تبدیلی ہوجاتی ہے۔ سچ ہر حال میں سچ اور جھوٹ ہر حالت میں جھوٹ ہی رہتا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' صفیہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے تائیدی انداز میں بولی۔ ''مجھے زندگی میں بار بار اس حقیقت کا تجربہ ہوا ہے۔''

میں نے اس تعاون پر ان ماں بیٹی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اٹھ کر دوبارہ گمشدہ نازلی کے گھر آگیا۔



دوپہر کے بعد کانسٹیبل نوازش واپس آگیا۔

وہ لنگڑے جما کے بارے میں ایک سنسنی خیز تحقیق کرکے لوٹا تھا۔ اس نے پورے ایمن آباد میں گھوم پھر کر اور مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ کرکے یہ معلوم کرلیا تھا کہ گزشتہ شام وہ کانا گھڑسوار جمال دین عرف جما مجھ سے ملاقات کے بعد کس طرف گیا تھا۔ نوازش کے انکشاف نے اس کیس کی ایک واضح شکل نکال دی تھی۔ اس کے مطابق' وہ کانا جما اپنے گھوڑے پر سوار کامونکی جانب گیا تھا۔

میں نے صفیہ کے گھر سے اٹھ کر سخاوت علی اور بشریٰ سے دوبارہ ملاقات کی تھی اور انہیں نازلی کے مصدقہ کارنامے سے بھی آگاہ کیا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے کہ نازلی کا کوئی ایسا ویسا چکر بھی ہوسکتا ہے لیکن چاندی کی انگوٹھی' ریشمی رومال اور سب سے بڑھ کر عارفہ کی گواہی کے آگے وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کرسکے اور یہ کہہ کر انہوں نے خاموشی اختیار کرلی کہ...... خدا گواہ ہے' ہمیں نازلی کے اس معاملے کی کوئی خبر نہیں......!

میں نے ان سے کامونکی والے اسلم عرف بھولا کے بارے میں بھی استفسار کیا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ سخاوت کی چھوٹی بہن زینت کے پڑوس میں اللہ دتہ اور رحمت بی بی کا گھر ہے۔ اللہ دتہ کے لڑکے کا نام بھولا ہی تھا۔ گویا عارفہ کے انکشاف کی تصدیق ہوگئی' لیکن اس سلسلے کی ایک کڑی ابھی تک میرے ذہن میں چبھن پیدا کررہی تھی۔ سخاوت اور بشریٰ نے اسلم عرف بھولا کا جو حلیہ اور وضع قطع بیان کی تھی وہ جما سے قطعی مختلف تھی...... اس کا واضح طور پر ایک ہی مطلب تھا کہ ناجما اور بھولا دو بالکل مختلف اور الگ کردار تھے اور عین ممکن تھا...... یہ دونوں آپس میں دوست ہوں اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان میں شدید نوعیت کی دشمنی ہو۔

میں نے سخاوت علی کے گھر سے نکلتے ہوئے اس کی کامونکی والی بہن کے گھر کا مکمل پتا اچھی طرح سمجھ لیا تھا کیونکہ نازلی تک رسائی حاصل کرنے کیلئے اسلم عرف بھولا کو زیر تفتیش لانا بہت ضروری ہوگیا تھا۔

ہم دونوں اس وقت بیٹھے اسی معاملے پر غور و فکر کررہے تھے اور اس بات پر متفق تھے کہ ہمیں فی الفور کامونکی کی طرف روانہ ہوجانا چاہئے۔ میں نے کہا۔

''نوازش! اس برستی بارش میں' گھوڑوں پر سوار ہوکر کامونکی کا رخ کرنا تو عقل مندی نہیں ہوگی۔ ہمیں کوئی دوسرا ہی ذریعہ اختیار کرنا ہوگا۔''

''دوسرا ذریعہ تانگہ ہوسکتا ہے ملک صاحب۔'' وہ تجویز دینے والے انداز میں بولا۔

''آپ کہیں تو میں سخاوت علی کو لے کر آجاتا ہوں۔''

سخاوت علی کے نام پر میں چونک اٹھا اور مجھے یاد آیا کہ وہ کوچوانی کرتا تھا۔ اس افراتفری میں میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا کہ سخاوت کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ کامونکی تک رسائی حاصل کرنے کیلئے سخاوت علی کے تانگے سے زیادہ مناسب اور کوئی سواری نہیں ہوسکتی تھی۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے نوازش سے کہا۔ ''تم فوراً سخاوت علی کو اس کے تانگے سمیت پکڑ لاؤ۔ ہم ابھی کامونکی روانہ ہورہے ہیں۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور مجھے سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

آج بارش کا زور کل کی نسبت تو کم تھا لیکن وہ وقفے وقفے سے اپنا فریضہ پورا کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔ کبھی بوندا باندی کی شکل میں' کبھی بوچھار کی صورت' کبھی چند چھینٹوں کے

روپ میں تو کبھی موسلا دھار...... وہ اپنا جلوہ دکھا ہی رہی تھی۔ ہماری یہ خوش قسمتی تھی کہ جب ہم کامونکی کی جانب روانہ ہونے لگے تو یہ بوندا باندی کے ڈھب پر چل رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں کانسٹیبل نوازش' سخاوت علی کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ بیٹی کی گمشدگی کے غم میں نڈھال ہورہا تھا اور جلد از جلد اس کی بازیابی کا خواہاں تھا۔ لہٰذا میری بات فوراً ہی اس کی سمجھ میں آگئی۔ پھر پانچ منٹ بعد ہی ہم تینوں تانگے میں بیٹھ کر کامونکی کی جانب روانہ ہوگئے۔ سخاوت کوچوان اور کانسٹیبل نوازش اگلی سیٹ پر تھے اور میں عقبی نشست پر براجمان تھا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد ہم بہ خیر و عافیت کامونکی پہنچ گئے۔

ہم سیدھے سخاوت کی بہن زینت کے گھر گئے اور انہیں تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا۔ یہ سن کر سب کو سخت افسوس ہوا کہ نازلی کہیں غائب ہوگئی تھی۔ میں نے خاص طور پر زینت کی دو بڑی بیٹیوں سے پوچھ گچھ کی۔ موضوع تفتیش نازلی اور بھولا کا باہمی ''معاملہ'' ہی تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی اس چکر سے واقف نہ ہو' اگر واقعی یہ کوئی چکر تھا تو......!

تھوڑی سی محنت کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ میں اٹھا اور بھولا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا ڈالا۔ زینت اور اللہ دتہ کے گھروں کے دروازے پہلو بہ پہلو تھے۔ اس وقت میرے ساتھ نوازش بھی تھا۔ ہم دونوں پولیس کی یونیفارم میں تھے۔ سخاوت علی کو ہم نے گھر کے اندر ہی چھوڑ دیا تھا۔

دروازہ اسلم عرف بھولا کی ماں رحمت بی بی نے کھولا۔ وہ اس وقت گھر میں اکیلی ہی تھی۔ بعدازاں مجھے معلوم ہوا کہ بھولا ان میاں بیوی کی اکلوتی اولاد تھا۔ دو پولیس والوں کو اپنے سامنے دیکھ کر رحمت بی بی گھبرا گئی۔

گھر کے اندر پہنچ کر جب میں نے اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا تو اس کی گھبراہٹ وحشت میں بدل گئی۔ وہ بڑی تیزی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''بھولا تو بہت ہی بی با بچہ ہے جی...... وہ ایسا کام نہیں کرسکتا۔ آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہے......''

''وہ کتنا بھولا اور بی با ہے' اس بات کا پتا تو اس وقت چلے گا جب وہ میرے ہاتھ آئے گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ وہ اس وقت ہے کہاں؟''

''وہ تو جی...... کل صبح سے لاہور گیا ہوا ہے۔'' وہ پریشانی سے بولی۔ ''دو تین دن کے بعد واپس آئے گا۔''

بھولا کا مونکی میں موجود نہ ہونا بھی اسی امر پر دلالت کرتا تھا کہ نازلی کی گمشدگی میں سراسر اسی کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ میں نے کڑے لہجے میں رحمت بی بی سے پوچھا۔

''وہ لاہور کیا کرنے گیا ہے؟''

''اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہے جی۔''

''لاہور میں اس کا دوست کس جگہ رہتا ہے؟''

''مجھے نہیں پتا جی...... وہ اپنے باپ کو بتا کر گیا ہے۔''

''اللہ دتہ اس وقت کہاں ملے گا؟'' میں نے بھولا کے باپ کے بارے میں پوچھا۔

''وہ منڈی میں ہے جی۔'' رحمت بی بی نے بتایا۔ ''شام کو ہی واپس آئے گا۔''

اللہ دتہ کامونکی کی غلہ منڈی میں کام کرتا تھا۔ میں نے رحمت بی بی کے ساتھ مزید وقت صرف کرنا مناسب نہ جانا اور نوازش علی کو لے کر غلہ منڈی پہنچ گیا۔ اس جانب کا رخ کرتے وقت میں نے سخاوت علی کو سختی سے ہدایت کردی تھی کہ جب تک میں واپس نہ آؤں وہ اپنی بہن کے گھر میں رک کر میرا انتظار کرے گا۔

غلہ منڈی کامونکی پہنچ کر میں نے اس آڑھتی کی دکان تلاش کی جہاں اللہ دتہ کام کرتا تھا۔ مذکورہ آڑھتی کا نام شوکت حسین تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں شوکت حسین آڑھتی کی دکان پر اللہ دتہ کے روبرو تھا۔

میری بات سن کر اللہ دتہ پریشان ہوگیا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجھے تو یقین نہیں آ رہا جناب......!''

''تمہاری یقینی اور بے یقینی کا فیصلہ ان شاء اللہ! آج ہی کی تاریخ میں ہوجائے گا اللہ دتہ!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم ابھی اور اسی وقت بھولا کی تلاش میں لاہور روانہ ہو رہے ہیں اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے...... تم ہی ہمیں بھولا کے دوست کے گھر تک پہنچاؤ گے...... میری بات سمجھ رہے ہونا......؟''

''جی' سمجھ رہا ہوں۔'' وہ بے چارگی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اس موقع پر آڑھتی شوکت حسین نے قانون کے ساتھ اپنے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا۔

جب میں اللہ دتہ کو صورتحال کی سنگینی سے آگاہ کر رہا تھا تو شوکت حسین بھی ہمارے پاس ہی موجود تھا۔ پوری بات سننے اور اسے محسوس کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اپنی کار میں لاہور پہنچا سکتا ہوں۔ لاری یا بس میں لاہور پہنچنے میں آپ کو کافی وقت لگ جائے گا' پھر بس سٹینڈ سے بھولا تک رسائی حاصل کرنے میں بھی اچھا خاصا وقت لگے گا جبکہ......'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کیلئے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جبکہ میری کار میں آپ لوگ آدھے وقت میں اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔''

میں نے چشم زدن میں آڑھتی شوکت حسین کی پیشکش سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا اور ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ہم لوگ کامونکی سے لاہور کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔



لاہور کا دورہ بڑا کامیاب ثابت ہوا تھا۔

میں اس وقت اپنے تھانے میں بیٹھا تھانیداری کر رہا تھا۔ نازلی اور بھولا میرے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان دونوں کے باپ بھی ایک طرف بنچ پر بیٹھے خفگی آمیز نظروں سے انہیں گاہے بگاہے دیکھ رہے تھے اور باہر بارش اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا اور اس گھپ تاریکی میں برستی بارش کی آواز بڑا عجیب سا تاثر پیدا کررہی تھی۔

لاہور میں بھولا کے دوست کا گھر تلاش کرنے میں مجھے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ منظور احمد نامی وہ شخص کرشن نگر کے علاقے میں رہتا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ جب ہم نے منظور احمد کے گھر پر چھاپہ مارا تو نازلی اور بھولا گھر کے اندر موجود تھے۔ اس تمام تر کارروائی میں آڑھتی شوکت حسین نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ واپسی میں مجھے تھانے پہنچانے کے بعد ہی اپنے گھر گیا تھا۔

جب ہم لوگ نازلی اور بھولا کو لے کر لاہور سے واپس آرہے تھے تو ہم نے کامونکی سے سخاوت علی کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

جب کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار کرلیتا ہے تو پھر اس سے آگے کا کیس بہت سیدھا اور آسان ہوجاتا ہے۔ نازلی اور بھولا کی ندامت کے بوجھ سے جھکی ہوئی گردنیں اقبال جرم کی

مرد مثال تھیں‘ لیکن میں نے اس اظہار شرمندگی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی زبان سے بھی تسلیم کرایا کہ یہ مجرمانہ حماقت ان سے سرزد ہوئی تھی۔

میں نے اللہ دتہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بھولا نے نازلی کو گھر سے بھگا کر جو جرم کیا ہے اس کیلئے میں اسے سیدھا جیل بھجوا سکتا ہوں۔“

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے روئے سخن سخاوت علی کی طرف موڑا اور بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”بھولا چلا جائے گا اور نازلی کو تم اپنے ساتھ گھر لے جاؤ گے لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ بھولا جیل کے اندر سزا کاٹے گا اور نازلی گھر کے اندر بیٹھ کر......!“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب......!“ وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”نازلی کو آپ کیوں سزا دیں گے؟“

”نازلی کو میں نہیں بلکہ یہ معاشرہ سزا دے گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جو لڑکی ایک مرتبہ گھر سے بھاگ جاتی ہے پھر معاشرہ اس کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ کہیں اس کا کوئی معقول رشتہ نہیں آتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ سخاوت نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ لوگ میرے مشورے پر عمل کیلئے تیار ہو جاؤ تو اس پیچیدہ مسئلے کو ادھر تھانے ہی میں حل کیا جا سکتا ہے۔“

”جی‘ آپ حکم کریں......!“ وہ بیک زبان بولے۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنی محبت کی تکمیل کیلئے بہت ہی غلط قدم اٹھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں‘ اگر ہم سب مل کر ان کی غلطی کو معاف کر دیں تو ان کی زندگی بڑی عزت سے گزر سکتی ہے۔“

”آپ کا اشارہ ان کی شادی کی طرف ہے......؟“ اللہ دتہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”بالکل...... میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی‘ پھر سخاوت علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں نازلی اور بھولا کی شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں سخاوت

علی......؟“

حالات نے ان تمام کرداروں کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ کسی کی زبان میری تجویز سے انکار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ایک ماہ کے اندر ہی دونوں خاندانوں نے میرے مشورے پر عمل کر ڈالا۔

اس موقع پر بھولا اور نازلی کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ دل و جان سے میرے احسان مند تھے کہ میں نے دو محبت کرنے والوں کو قانوناً اور شرعاً ایک ڈور سے باندھ دیا تھا۔

چند روز کے بعد کانا جما دوبارہ میرے پاس آیا اور اس نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ کبھی فرصت ملی تو یہ کہانی بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔



فتنہ ہوس

موت برحق ہے اور کائنات کی سب سے بڑی سب سے زیادہ تلخ حقیقت بھی۔ کوئی شخص خدا کی ذات پر (نعوذباللہ) یقین رکھتا ہو یا نہیں مگر وہ موت سے انکار نہیں کرسکتا۔ زندگی کو موت کی امانت اور موت کو زندگی کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال موت ہو یا زندگی ..... دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ٹھہرتی ہیں۔ کسی ایک کے انکار سے خود بخود دوسری کی نفی ہوجاتی ہے۔ سال ہا سال سے موت بڑے تواتر کے ساتھ زندگی کو نگلتی چلی آرہی ہے اور زندگی اس بات پر خوش ہے کہ ایک دن اس موت کو بھی موت آجائے گی.....

صغریٰ..... عرف سگی کی بھی موت آئی تھی اس لئے وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ اس کی موت کی خبر صابر علی کے توسط سے مجھ تک پہنچی تھی۔

ان دنوں میں ضلع گجرات کے ایک دور دراز تھانے میں تعینات تھا اور سگی موضع سعید نگر کی رہنے والی تھی۔ مذکورہ گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ لگ بھگ ایک ہزار نفوس سے آباد سعید نگر میرے تھانے سے آدھے میل کے فاصلے پر مغرب میں واقع تھا۔ اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔

میں نے اطلاع کنندہ صابر علی کو فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک پندرہ سولہ سالہ خوب رو نوجوان بھی تھا۔ صابر علی نے درمیانے سائز کی ڈاڑھی رکھ چھوڑی تھی۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد جب سوالیہ نظر سے اس نوجوان کی طرف دیکھا تو صابر علی نے بتایا کہ وہ سگی کا چچازاد ایوب تھا۔

جب وہ دونوں میرے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے صابر علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''ہاں بھئی! صبح صبح کس معاملے نے تم لوگوں کو تھانے پہنچا دیا ہے؟''

''سگی نے خودکشی کرلی ہے تھانیدار صاحب.....'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''ہم آپ کو لینے کیلئے آئے ہیں۔''

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور سگی کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے مجھے مختصراً صورتحال سے آگاہ کیا۔ میں نے سوال کیا۔

''سگی سے تمہارا کیا رشتہ ہے صابر علی؟''

''جی..... میں تو پٹواری صاحب کا پڑوسی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایوب پٹواری مشتاق کا بیٹا ہے۔ سگی انہی کے گھر میں رہتی تھی۔ میں تو بس ساتھ آگیا ہوں جناب.....!''

اس علاقے کے زیادہ تر لوگوں سے ابھی میری شناسائی نہیں ہوئی تھی البتہ مشتاق پٹواری کا نام میں نے سن رکھا تھا' اگرچہ اس سے میری ایک بھی ملاقات نہیں تھی۔ وہ سعید نگر کی ایک معروف شخصیت تھا۔

میں نے صابر علی سے پوچھا۔ ''خود پٹواری صاحب کہاں ہیں؟ اس واقعہ کی اطلاع دینے تو انہیں تھانے آنا چاہئے تھا۔''

''ابا جی گوجرانوالہ گئے ہوئے ہیں۔'' ایوب نے بتایا۔ ''وہ آج شام تک واپس آجائیں گے۔''

وہ صبح کا وقت تھا اور میں ابھی اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا۔ میں نے ایوب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''وہ اتنی صبح گوجرانوالہ کیا لینے چلے گئے ہیں؟''

''وہ آج نہیں گئے۔'' ایوب نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ کل دوپہر کے بعد یہاں سے گئے تھے۔ ان کا رات کو گوجرانوالہ میں رکنے کا پروگرام تھا۔ یہ بات انہوں نے جانے سے پہلے گھر میں بتادی تھی۔''

میں نے سگی کی موت کے حوالے سے دو تین ضروری سوالات کئے' پھر ان لوگوں کے ہمراہ جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ کانسٹیبل امانت علی بھی میرے ساتھ تھا۔



سعید نگر میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی چلتے ہوئے گاؤں پہنچ گئے۔ آدھے میل کا فاصلہ ہوتا ہی کتنا سا ہے' باتوں میں کٹ گیا اور چند منٹ کے بعد ہم سعید نگر کے

اندر تھے۔ اس گاؤں میں کم بیش اڑھائی سو گھر آباد تھے جن میں سب سے نمایاں تو چودھری فرزند علی کی حویلی تھی جو غیر تحریری طور پر سعید نگر کا حاکم بھی تصور کیا جاتا تھا۔ چند لمحات کے بعد میں' صابر علی اور ایوب کی معیت میں مشتاق پٹواری کے گھر پہنچ گیا۔

مشتاق پٹواری کا گھر خاصا کشادہ اور شاندار تھا جس کا رقبہ پندرہ مرلے سے کم نہیں تھا۔ کراچی میں رہنے والے اسے ساڑھے تین سو گز سمجھ لیں۔ اس رقبے کا زیادہ تر حصہ وسیع و عریض صحن کی شکل میں کھلا ہوا تھا جس کے وسط میں جامن کا ایک قدآور اور چھتناور درخت ایستادہ تھا۔ ڈھکے ہوئے حصے میں ایک بیٹھک' چار رہائشی کمرے' برآمدہ' غسل خانہ' باورچی خانہ اور ایک مویشیوں کا کمرہ شامل تھا۔ میری خواہش پر فوراً مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں صغریٰ عرف سگی نے خودکشی کی تھی۔

موت کا منظر کسی بھی صورت خوشگوار نہیں ہوسکتا' لیکن سگی کے حوالے سے میں بلا مبالغہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی موت کا نظارہ دل ہلا دینے والا اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ جب میری نگاہ پہلی مرتبہ اس کی لاش پر پڑی تو وہ کمرے کی چھت سے جھول رہی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی گردن میں مضبوط رسی کا پھندا کسا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور گردن کی لمبائی میں نمایاں اضافہ نظر آتا تھا۔ پھندا بردار رسی کا دوسرا سرا چھت کے شہتیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ سگی کی لاش کمرے کے فرش پہ کوئی دو فٹ اونچائی پر لٹک رہی تھی' مطلب یہ کہ اس کے پاؤں اور کمرے کے فرش کے درمیان بمشکل دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس جھولتی' لٹکتی لاش کے قریب ہی فرش پر ایک چوبی سٹول الٹا پڑا تھا۔ سٹول کے لفظ میں نے آسانی کیلئے استعمال کیا ہے ورنہ درحقیقت وہ ایک سٹول نما سٹینڈ تھا جو عموماً مٹی کے گھڑوں کے نیچے رکھا جاتا ہے۔ اپنے پایوں اور بناوٹ کے لحاظ سے وہ ایک سٹول ہی دکھائی دیتا ہے۔ بس' اس کی ٹاپ مسطح نہیں ہوتی بلکہ پانی والے گھڑے کو محفوظ سہارا فراہم کرنے کیلئے اس کو چکھٹا نما بنایا جاتا ہے۔

میں نے کانسٹیبل امانت اور مشتاق پٹواری کے پڑوسی صابر کی مدد سے سگی کی لاش کو ''بحفاظت'' نیچے اتار لیا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ سگی نے موسم کی مناسبت سے گرم لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور پرکشش لڑکی تھی۔ عمر تئیس اور چوبیس کے درمیان رہی ہوگی لیکن اب کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ اس کی تمام تر خوبصورتی اور رعنائی خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی چھت سے جھولتی ہوئی لاش کو دیکھ کر پہلی نظر ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ

اب اس کا شمار زندہ انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ معائنے نے بھی میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔

میں نے جائے وقوعہ کی کارروائی کو نمٹایا اور سگی کی لاش کو کانسٹیبل امانت کی نگرانی میں پوسٹمارٹم کیلئے سرکاری ہسپتال بھجوانے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس موقع پر پٹواری کی بیوی زلیخا نے مجھ سے کہا۔

''تھانیدار صاحب! پٹواری جی کو تو آنے دیں پھر سگی کی لاش کو آپ......!''

''کیا پٹواری صاحب گھنٹے' دو گھنٹے میں آ جائیں گے؟'' میں نے زلیخا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ تو جی شام تک ہی گوجرانوالہ سے واپس آئیں گے۔''

''میں شام تک ان کی واپسی کے انتظار میں لاش کو ادھر نہیں چھوڑ سکتا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''وہ جب واپس آ جائیں تو انہیں میرے پاس تھانے بھیج دینا۔ میں خود ان سے بات کرلوں گا۔''

میرے حتمی انداز کے بعد زلیخا یا گھر کے کسی اور فرد نے کوئی اعتراض نہیں اٹھایا۔ میں نے امانت علی کو حکم دیا کہ وہ سگی کی لاش کو لے کر فی الفور ہسپتال کی جانب روانہ ہو جائے۔

''او کے ملک صاحب!'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں امانت علی کے جانے کے بعد زلیخا کے ساتھ بیٹھک میں آ گیا تاکہ اس اندوہناک واقعہ کی تفصیل جان سکوں تھانے سے اس طرف آتے ہوئے راستے میں صابر علی سے میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق اس گھر میں کل چھ افراد رہتے تھے۔ پٹواری مشتاق' اس کی بیوی زلیخا' بڑی بیٹی نغمہ' نغمہ سے چھوٹے دو بیٹے ایوب اور اسحاق اور صغراں عرف سگی۔ پٹواری مشتاق تو گوجرانوالہ گیا ہوا تھا اور سگی عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ باقی چاروں افراد اس وقت گھر کے اندر موجود تھے اور میں زلیخا کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھا تھا۔

میں نے مناسب انداز میں سگی کو پیش آنے والے واقعہ پر اظہار افسوس کیا' پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''زلیخا! مجھے پتا چلا ہے' سگی کافی عرصے سے تم لوگوں کے ساتھ رہ رہی تھی؟''

”جی...... پچھلے پانچ سال سے وہ ادھر ہی تھی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”اور اس کے ماں باپ......؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”کوئی چھ سال پہلے میرے جیٹھ یعنی سگی کے باپ کرم دین کا انتقال ہو گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔”سگی کا کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی۔ اس کی ماں خورشید بی بی نے اپنے خاوند کی موت کا بڑا گہرا صدمہ لیا تھا۔ ظاہر ہے سگی کو بھی کرم دین کے انتقال کا دکھ تھا لیکن خورشید نے گویا اس واقعہ کو اپنے اوپر طاری کر لیا تھا۔“ وہ سانس ہموار کرنے کیلئے تھمی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ وہ بڑی بہکی بہکی اور پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی حالت بگڑتی گئی' پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ سگی اس وقت لگ بھگ اٹھارہ سال کی تھی۔ یہ ایسی عمر ہوتی ہے کہ انسان خود کو سنبھالنے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن خورشید کی حالت ایسی تھی کہ ان دونوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا لہٰذا پٹواری جی اپنی بھابی اور بھتیجی کو یہاں لے آئے تھے۔“

”لیکن......“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔”خورشید تو مجھے گھر میں کہیں نظر نہیں آئی۔ کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے......؟“

”وہ بہت پہلے کہیں چلی گئی تھی۔“ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”پٹواری جی نے اپنے گھر لانے کے بعد حکیم سے بڑی توجہ کے ساتھ اس کا علاج کرایا تھا لیکن سال' ڈیڑھ سال کے علاج کے بعد بھی اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ میں تو کہوں گی کہ علاج جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا' اس کی دماغی صحت مزید بگڑتی چلی گئی۔ آخری دنوں میں تو اسے باقاعدہ دورے پڑنے لگے تھے۔ گردن مڑ جاتی' ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو جاتے اور منہ سے جھاگ بہنے لگتا۔ کئی بار تو اس کی زبان دانتوں تلے دب کر لہولہان ہو گئی تھی۔“

”یہ تو سیدھی سیدھی مرگی کی علامات ہیں۔“ میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولی۔”حکیم جی نے بھی یہی کہا تھا۔“

”لیکن زلیخا......“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔”تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ خورشید بہت پہلے کہاں چلی گئی تھی؟“

”میں کیا بتاؤں جی......“ وہ عجیب سے انداز میں بولی۔”یہ بات تو کوئی بھی نہیں جانتا

کہ وہ کہاں غائب ہو گئی۔ وہ اپنے پاگل پن میں گھر سے باہر تو نکل ہی جایا کرتی تھی لیکن اپنی گلی کے اندر ہی رہتی تھی۔ ہم لوگ اسے پکڑ کر واپس لے آتے تھے لیکن ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ پھر کبھی پلٹ نہیں سکی......“

بڑے افسوسناک انداز میں وہ بات ختم کر کے خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔”کیا آپ لوگوں نے خورشید کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟“

”بہت کوشش کی تھی تھانیدار صاحب......!“ وہ ایک ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے بولی۔”سعید نگر کیا' ہم نے پورا گجرات اور اس کے گاؤں دیہات چھان مارے تھے۔ پٹواری جی نے کسی رشتے دار یا جاننے والے کا گھر نہیں چھوڑا لیکن یہ تمام تر تلاش بیکار ثابت ہوئی' خورشید کا کہیں پتا نشان نہیں مل سکا تھا اور آج تک یہ راز' راز ہی ہے کہ وہ آخر گئی کہاں۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ اب اس دنیا میں باقی بھی ہے یا......؟“

بڑے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ خاموش ہو گئی۔

”خورشید کی گمشدگی والے معاملے پر تو ہم بعد میں بات کریں گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔”فی الحال تم مجھے یہ بتاؤ کہ سگی نے کیوں خودکشی کی ہے؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھانیدار صاحب۔“ وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔”رات کو تو وہ اچھی خاصی اپنے کمرے میں سوئی تھی۔ صبح جب ہم نے دیکھا تو وہ چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ میں تو خود حیران ہوں کہ اس کو ہوا کیا۔“

”کیا سگی اس کمرے میں اکیلی ہی رہتی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی' ہم نے یہ کمرہ سگی اور خورشید کو دے دیا تھا۔“ اس نے بتایا۔”وہ دونوں ماں بیٹی اسی کمرے میں رہا کرتی تھیں' پھر جب خورشید اچانک غائب ہو گئی تو اس کے بعد سے کمرہ سگی کے استعمال میں آ گیا تھا۔“

”باقی کمروں میں افراد خانہ کس حساب سے آباد ہیں؟“ میں نے اپنی معلومات کیلئے پوچھ لیا۔

”دیکھیں جی' یہ تو بیٹھک ہے ہماری' جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔“ وہ بتانے لگی۔”اسی لائن میں دیوار کے ساتھ دو کمرے ہیں۔ ایک میں میرا بڑا بیٹا ایوب اور دوسرے میں نغمہ اور اسحاق رہتے ہیں۔ پھر عقبی دیوار کے ساتھ ان کمروں سے ملحقہ دو کمرے بنے

ہوئے ہیں۔ ایک میں پٹواری جی اور میں رہتے ہیں اور دوسرے میں سگی کی رہائش تھی جہاں اس نے چھت سے لٹک کر خود کو پھانسی دی ہے.....'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کیلئے متوقف ہوئی' پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔

''ایک کمرہ بیٹھک کے سامنے' دوسری دیوار کے ساتھ بنا ہوا ہے جو کہ مال مویشی کیلئے مخصوص ہے' جہاں ہم اپنے جانوروں کیلئے چارہ وغیرہ ذخیرہ کرتے ہیں یا پھر سخت سردی اور بارش کے موسم میں جانوروں کو اس کمرے کے اندر باندھ دیا جاتا ہے۔''

اس نے اپنا طویل بیان ختم کیا تو میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔ ''زلیخا! تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا ہے کہ پچھلی رات کو سگی ٹھیک ٹھاک اپنے کمرے میں سونے کیلئے گئی تھی لیکن صبح جو کچھ دیکھنے کو ملا وہ بالکل مختلف تھا۔ اس سے تمہاری سمجھ میں کیا آتا ہے؟''

''میری تو مت ماری گئی ہے تھانیدار صاحب.....!'' وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ سگی نے ایسی خطرناک حرکت کی کیوں ہے۔''

''زلیخا! ماشاء اللہ! تم سیانی بیانی ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اتنا تو تم سمجھ ہی سکتی ہو کہ کوئی انسان خوامخواہ تو اپنی جان نہیں لے لیتا۔ کوئی بہت بڑی مجبوری ہی انسان کو اپنی جان کا دشمن بنالیتی ہے۔ جب کسی شخص کیلئے زندہ رہنا ممکن نہیں رہتا تو وہ خودکشی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔'' وہ پرسوچ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''میں بھی اسی سبب تک پہنچنا چاہتا ہوں جس نے سگی کو خودکشی پر مجبور کیا تھا؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''سبب کے بارے میں کیا کہوں جی۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''مجھے تو یہ اس ک پاگل پن ہی لگتا ہے۔''

''پاگل پن.....کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ جی کہ.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''انسان بیٹھے بٹھائے اپن جان سے کھیل جائے تو اسے پاگل پن ہی تو کہیں گے' ویسے ایک بات پر غور کرنا بھی ضرور

ہے۔''

''کون سی بات؟'' وہ معنی خیز انداز میں خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''میں کچھ عرصے سے یہ محسوس کر رہی تھی کہ سگی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ بہت کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی۔ بعض اوقات الٹی سیدھی باتیں بھی کر جاتی تھی۔ اس کی حالت کو دیکھ کر کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگنے لگتا تھا۔''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر جھرجھری لی تو میں نے پوچھا۔ ''کس بات کا ڈر؟''

''آپ کو میں نے بتایا ہے نا' سگی کی ماں خورشید کی دماغی کیفیت کیا رہی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''سگی کی حالت کو دیکھ کر بعض اوقات مجھے ڈر لگنے لگتا تھا کہ کہیں وہ بھی اپنی ماں کی طرح پاگل نہ ہوجائے اسی لئے میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ سے کہا ہے کہ.....'' وہ سانس ہموار کرنے کیلئے تھمی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''سگی نے پاگل پن میں چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی ہے۔''

''ہوں.....!'' میں چند لمحات کیلئے گہری سوچ میں ڈوب گیا' پھر کہا۔ ''اس بات کا پتا تو میں چلا ہی لوں گا کہ اس نے کون سے ''پن'' کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو موت کے حوالے کیا ہے۔ تم فی الحال مجھے یہ بتا دو کہ گزشتہ رات اس کا کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ یا تلخ کلامی تو نہیں ہوئی تھی؟''

''اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ''ہم سب لوگ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ نغمہ' ایوب اور اسحاق تو اسے اپنی سگی بہن سمجھتے تھے۔ ان چاروں کا کبھی آپس میں کسی بات پر بڑا اختلاف نہیں ہوا۔ میں سمجھتی ہوں.....'' وہ چند لمحات کیلئے متوقف ہوئی' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے یقین ہے' خودکشی والے فیصلے میں سراسر اس کی اپنی مرضی شامل ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس نے ایسا سنگین قدم کیوں اٹھایا۔ اس گھر میں تو اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔''

''پوسٹمارٹم کی رپورٹ اس حقیقت کو کھول دے گی کہ سگی نے کسی اندرونی یا بیرونی تکلیف کیلئے اپنی جان دی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اس معاملے کے بارے میں اور کچھ جانتی ہو تو بتاؤ؟''

''نہیں جی۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں اور کچھ نہیں جانتی۔''

''پٹواری جی کب گوجرانوالہ گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کل دوپہر کے بعد یہاں سے گئے تھے۔''

''آج رات تک وہ واپس آئیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں گھر کے دوسرے افراد سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے زلیخا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خاص طور پر تمہاری بیٹی نغمہ سے......؟''

مجھے پتا چلا تھا کہ نغمہ کی عمر بیس سال تھی۔ اس بات کے قوی امکانات تھے کہ نغمہ' سگی اور اس کے داخلی معاملات کے بارے میں سب سے زیادہ جانتی ہوگی۔

''میں ان کو بھیجتی ہوں جی.....'' یہ کہتے ہوئے زلیخا بیٹھک سے نکل کر گھر کے اندرونی حصے کی جانب چلی گئی۔

زلیخا کے بڑے بیٹے ایوب سے میں مل چکا تھا۔ وہ اپنے پڑوسی صابر علی کے ساتھ اس واقعہ کی اطلاع دینے تھانے آیا تھا۔ اس سے چھوٹا اسحاق تھا جس کی عمر بارہ کے قریب رہی ہوگی۔ میں نے ان تینوں سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کئے لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہ آسکی جو سگی کی خودکشی پر کسی زاویے سے روشنی ڈال سکتی۔ میں تھوڑی دیر کے بعد یہ کہتے ہوئے زلیخا کے گھر سے نکل آیا۔

''پٹواری جی جب گوجرانوالہ سے واپس آجائیں تو انہیں میرے پاس تھانے بھیج دینا۔ باقی معلومات میں ان سے حاصل کرلوں گا۔''

اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں واپسی کیلئے چل پڑا۔ اس واقعہ نے مجھے دل گرفتہ کردیا تھا۔ پتا نہیں کیوں' رہ رہ کر مجھے خیال آرہا تھا کہ سگی کی موت کسی جنونی کیفیت یا فوری فیصلے کا نتیجہ ہرگز نہیں ہوسکتی۔

میں پٹواری مشتاق کے گھر سے نکلا تو باہر گلی میں بھی لگ بھگ نصف درجن افراد کو جمع دیکھا۔ میں نے ان سے بھی ہلکی پھلکی پوچھ گچھ کی' لیکن وہ لوگ میری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کرسکے۔ میں صابر علی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے تھانے کی جانب بڑھنے لگا۔

صابر علی کی عمر تیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ چونکہ پٹواری کا پڑوسی تھا لہٰذا اس سے

سوالات کرنا خاصا فائدہ مند ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''صابر علی! تم کرتے کیا ہو؟''

''بس جی' محنت مزدوری کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کس قسم کی محنت مزدوری؟''

''زیادہ تر تو میں کھیتوں میں کام کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ بھی جو کام مل جائے' انکار نہیں کرتا۔ بیوی بچوں کا پیٹ تو پالنا ہے نا جناب......''

''تم پٹواری صاحب کے پڑوس میں کب سے رہ رہے ہو؟''

''میں تو جناب اس گھر میں پندرہ بیس سال سے رہ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ پوچھیں کہ پٹواری جی کب سے میرے پڑوس میں آباد ہیں۔''

''کیا مطلب صابر علی......!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتا ہو کہ پٹواری پہلے کہیں اور رہتا تھا؟''

''جی ہاں' یہی حقیقت ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہاں تو یہ لوگ پانچ چھ سال پہلے آکر آباد ہوئے ہیں۔ یہ گھر دراصل پٹواری مشتاق کے بڑے بھائی کرم دین کا تھا۔ پہلے وہی خورشید اور سگی کے ساتھ اس گھر میں رہا کرتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد یہ تبدیلی آئی تھی۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ پٹواری مشتاق نے بڑے بھائی کی موت کے بعد اسی کے گھر میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''بجائے اس کے کہ وہ اپنی بھتیجی اور بھابی کو اپنے گھر لے جاتا' وہ اپنا گھر چھوڑ کر بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہوگیا تھا۔''

''جی ہاں' بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''پٹواری جی کا اپنا گھر بہت چھوٹا تھا۔ وہاں یہ سب لوگ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا بیوہ بھابی اور یتیم بھتیجی کی ہمدردی میں پٹواری جی ادھر ہی آبسے تھے۔''

''ہمدردی......!'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ہمدردی جتانے کا یہ خاصا منفرد اور انوکھا طریقہ ہے بھئی۔''

وہ میرے اس تبصرے پر کچھ نہیں بولا۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے تھانے کے قریب پہنچ

گئے۔ میں نے تھانے کی چار دیواری کے پاس رک کر اس سے پوچھا۔

''صابر علی! سگی کی موت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''جی.....'' وہ متاملانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس نے خودکشی کی ہے جناب۔''

''خودکشی کی ہے' یہ تو اس کی چھت سے لٹکتی ہوئی لاش کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تم سے اس خودکشی کے سبب کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ سگی ایسا سنگین قدم اٹھانے پر کیوں مجبور ہوئی......؟''

''نہیں جناب...... مجھے اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہے۔'' وہ بے بسی سے مجھے تکنے لگا۔

''اندازہ نہیں ہے تو اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ان کے پڑوسی ہو۔ میں اندر کے حالات جاننا چاہتا ہوں۔'' ''تم میری بات سمجھ رہے ہونا......؟''

میرے پراسرار اور انتہائی سنجیدہ انداز کو دیکھتے ہوئے وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''جی سمجھ رہا ہوں تھانیدار جی' اس کام کے پیچھے میں رضیہ کو لگاتا ہوں جی......''

''رضیہ...... یہ رضیہ کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''رضیہ...... میری بیوی ہے جی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ کھوج کھرا لگانے والے کاموں کی بڑی ماہر ہے جناب۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی بیوی کو اس مشن پر لگا دو اور جیسے ہی کوئی خاص بات پتا چلے' تم فوراً میرے پاس آ جانا۔''

''جی......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ جیسا کہہ رہے ہیں' میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔''

''لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر۔'' میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''اور یہ بات تم اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھا دینا۔''

''جی...... ٹھیک ہے۔'' وہ بڑی فرمانبرداری سے بولا۔



اس روز میں تھانے میں بیٹھا سگی کی خودکشی کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ میں نے اپنی

پیشہ ورانہ زندگی میں خودکشی کی بہت سی وارداتیں دیکھی تھیں لیکن سگی والے معاملے میں مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ یہ عجیب کیا تھا' میں سر دست اسے کوئی نام دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ صابر علی کی فراہم کردہ معلومات نے بھی میرے ذہن میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پٹواری مشتاق پہلے سعید نگر کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد وہ بیوی بچوں سمیت اس کے گھر میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے گاؤں والوں پر یہی ظاہر کیا تھا' جیسا کہ صابر علی کی باتوں سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ عجیب و غریب ''نقل مکانی'' پٹواری نے اپنی بیوہ بھابی اور یتیم بھتیجی کی ہمدردی میں کی تھی لیکن میرا ذہن اس نوعیت کی ہمدردی کو قبول کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں تھا۔ مجھے تو پٹواری کے اس عمل کے پیچھے کسی گہری سازش کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

میں کسی ممکنہ سازش کو بے نقاب کرنے کیلئے بے چین ہو گیا لیکن سر دست مشکل یہ تھی کہ اس کہانی کے دو بڑے کردار اب منظر عام پر نہیں رہے تھے۔ سگی کی پاگل ماں خورشید تین سال پہلے کہیں غائب ہو گئی تھی اور سگی بھی اب عدم آباد کی جانب روانہ ہو چکی تھی گویا...... ایک پارٹی تو سرے سے غیر حاضر تھی۔ مجھے جو کچھ بھی معلوم کرنا تھا' دوسری پارٹی یعنی پٹواری اینڈ کمپنی ہی سے معلوم کرنا تھا اور وہ بھی طریقے اور سلیقے سے۔ اس کام کے آغاز کے طور پر میں نے صابر علی کو ایک اہم ذمہ داری سونپ دی تھی۔ اسے اپنی بیوی رضیہ کی مدد سے دیوار کی دوسری جانب کا احوال جاننا تھا۔

دوپہر کے بعد کانسٹیبل امانت علی واپس آ گیا۔ میں نے امانت علی کو سگی کی لاش کے ساتھ سرکاری ہسپتال بھیجا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ملک صاحب! میں نے سگی کی لاش کو ہسپتال پہنچا دیا ہے۔'' وہ میری نگاہ کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے بولا۔ ''ابتدائی رپورٹ کل شام تک یا پھر پرسوں صبح مل جائے گی......''

''ہوں......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''امانت! تم تو مقامی ہونا؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم لوگ پچھلی تین پیڑھیوں سے ادھر سعید نگر ہی میں رہ رہے ہیں۔ میرے پردادا کے زمانے سے۔''

"پھر تو تمہیں یہاں کے لوگوں اور ان کے حالات سے پوری واقفیت ہوگی......؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں...... بالکل!" وہ فخریہ انداز میں گردن اٹھاتے ہوئے بولا۔ "آپ حکم کریں' کسی کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں......؟"

"فی الحال تو میری تمام تر توجہ صغریٰ عرف سگی پر لگی ہوئی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ اپنے باپ کے انتقال کے بعد سگی اور اس کی ماں خورشید' پٹواری مشتاق کے ساتھ رہنے لگی تھیں اور وہ بھی اس طرح کہ پٹواری اپنے بال بچوں سمیت انہی کے گھر میں مقیم ہوگیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے امانت علی؟"

"جی ہاں' یہی حقیقت ہے......!" اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر اس واقعہ کی تفصیل سے مجھے آگاہ کرنے لگا۔

کانسٹیبل امانت علی نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ صابر علی کی زبانی پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ یہ تفصیلی واقعات ضرور تھے لیکن اس میں کوئی نئی اور چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"پٹواری مشتاق کی یہ ہمدردی بڑی عجیب ہی نہیں ہے؟"

"بہت عجیب ہے جناب......!" وہ آنکھوں کو گھماتے ہوئے بولا۔ "پٹواری مشتاق کی اس حرکت پر تو بڑی باتیں بھی بنی تھیں۔"

"کس قسم کی باتیں؟" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ...... یہی کہ......" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا کہ پٹواری مشتاق نے بہت بڑا اور لمبا ہاتھ مارا ہے......"

"لمبا ہاتھ مارا ہے...... کیا مطلب؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جناب! بات یہ ہے کہ پٹواری جی کے پاس پہلے ایک چھوٹا گھر تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بڑے بھائی کے انتقال کے بعد وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ان کے گھر میں آ کر بس گیا۔ اپنا چھوٹا گھر کچھ دنوں کے بعد اس نے فروخت کر دیا تھا۔ اس موقع پر لوگوں نے کہا کہ پٹواری کو اپنی بیوہ بھابی یا یتیم بھتیجی سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ ہی دلچسپی بلکہ وہ اس بڑے مکان پر قابض ہونے کیلئے یہ جذباتی ڈرامہ کر رہا ہے......" وہ لمحے بھر کیلئے تھما'

ایک گہری سانس خارج کی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"پھر جب خورشید اپنا توازن کھو بیٹھی اور کچھ عرصے کے بعد گھر سے غائب ہوگئی تو لوگوں کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ خورشید کی اس ذہنی کیفیت کا ذمہ دار بھی پٹواری ہی ہے اور اب...... سگی بھی جان سے گئی!"

کانسٹیبل اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے جس اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا تھا وہ پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھا۔ پٹواری کے بڑے بھائی کرم دین کے انتقال کے بعد سے اب تک کی صورتحال کو اگر تنقیدی نظر سے دیکھا جاتا تو پٹواری مشتاق کا کردار کئی زاویوں سے شک کے دائرے میں قید نظر آتا تھا۔ میں انہی نکات پر غور کر رہا تھا کہ امانت علی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ملک صاحب! پچیس ایکڑ زمین اور وہ بھی نہری زرعی اراضی بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے......"

"یہ کیا قصہ ہے امانت علی؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"کرم دین کی پچیس ایکڑ زرعی اراضی بھی تھی۔" امانت علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب پٹواری مشتاق اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کیلئے خورشید اور سگی کے پاس آ گیا تو وہ پچیس ایکڑ زمین بھی پٹواری کے استعمال بلکہ پٹواری کے قبضے میں آ گئی۔ پچھلے پانچ چھ سال سے وہی اس زمین کی کاشتکاری کے معاملات دیکھ رہا تھا۔"

"پچیس ایکڑ اچھی خاصی زمین ہوتی ہے......" میں نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔

"اسی لئے تو لوگ اس انداز میں سوچ رہے تھے ملک صاحب......!" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "خورشید کے پاگل پن اور پھر گمشدگی کے بعد تو مکان اور زمین کچھ زیادہ ہی پٹواری کے قبضے میں چلی گئی تھی اور اب سگی کی المناک موت کے بعد تو ہر چیز کا مالک و مختار صرف اور صرف پٹواری ہی ہے۔"

سگی کی موت کے ذکر پر' میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ کافی دیر سے میری سوچ ایک بے نام سی الجھن کا شکار تھی۔ میں نے چونک کر امانت علی کی جانب دیکھا اور پوچھا۔

"جب ہم نے سگی کی لاش کو پھندے میں سے نکال کر چارپائی پر لٹایا تھا تو تم نے کوئی

خاص بات نوٹ کی تھی؟''

''کیسی خاص بات ملک صاحب۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

''کوئی غیر معمولی اور خلاف توقع بات......؟''

''میں سمجھا نہیں جناب۔'' اس کے تذبذب میں تشویش در آئی۔ ''آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں......؟''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے اپنے شک کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔ ''جب ہم نے سگی کو پھانسی پر لٹکے دیکھا تھا تو پھندے کے باعث اس کی گردن کی لمبائی میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا......؟''

''ایسا تو ہوتا ہے جناب......'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جب کوئی شخص پھانسی لگا کر خودکشی کرتا ہے تو لٹکنے کی وجہ سے اس کی گردن لمبی ہو جاتی ہے۔''

''اور اسی تناؤ یا کھنچاؤ کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی حلقوں سے باہر ابل پڑتی ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ہوتا ہے یا نہیں؟''

''بالکل ہوتا ہے ملک صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دم گھٹنے کے باعث جب بھی کسی شخص کی موت واقع ہوتی ہے تو اس کی آنکھیں ضرور باہر نکل آتی ہیں۔''

''لیکن سگی کے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہوا......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ......ٹھیک کہہ......رہے ہیں ملک صاحب......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اس کی آنکھیں تو بند تھیں جیسے......گہری نیند سو رہی ہو......''

''اس کا مطلب سمجھتے ہو؟ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

جواب دینے کے بجائے وہ منتظر نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''حقیقت کا پردہ تو پوسٹمارٹم کی رپورٹ ہی چاک کرے گی' مگر میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سگی کو پھانسی کے پھندے نے نہیں مارا......''

''پھر......؟'' وہ حیرانی سے منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔

''مجھے یقین ہے کہ سگی کی موت پھانسی کے پھندے تک پہنچنے سے پہلے ہی واقع ہو چکی

تھی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مردہ سگی کو پھانسی کے پھندے سے لٹکا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔''

''پھر تو یہ سیدھا سیدھا قتل ہوا نا......؟'' امانت علی کی آواز میں ہیجان جھلکتا تھا۔

''ہاں!'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''حالات و واقعات تو اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ پوسٹمارٹم کی رپورٹ صورتحال کی وضاحت کر دے گی۔''

''لیکن......سگی کی جان کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''تمہارا اندازہ کیا کہتا ہے امانت علی؟'' جواب دینے کے بجائے میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

''جناب! سیدھی سی بات ہے۔ میرا دھیان تو مشتاق پٹواری کی طرف جا رہا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''پٹواری کا پچھلا ریکارڈ بھی خاصا مشکوک ہے۔ اپنے بڑے بھائی کی زمین اور مکان پر قبضہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ کرم دین کی بیوہ خورشید اپنے پاگل پن میں پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے۔ اس زمین و جائیداد کی اکلوتی وارث یہ سگی ہی باقی بچی تھی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا......؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں امانت علی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے بڑے منفی انداز میں صورتحال کا تجزیہ کیا ہے لیکن مشتاق پٹواری تو کل دوپہر کو ہی گوجرانوالہ چلا گیا تھا اور سگی گزشتہ رات ٹھیک ٹھاک اپنے کمرے میں سوئی تھی۔ پٹواری کو سگی کی موت کے ساتھ نتھی کرنا تھوڑا دشوار محسوس ہو رہا ہے۔''

میں نے آخری جملہ اس مقصد کے تحت ادا کیا تھا کہ اگر امانت علی کے ذہن میں کوئی خاص بات ہو تو فوراً اس کی زبان پر آ جائے لیکن مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''یہ معاملہ پٹواری مشتاق کی واپسی پر ہی سلجھایا جا سکتا ہے ملک صاحب!''

''تمہارا کیا خیال ہے......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ہم جب پٹواری سے پوچھیں گے کہ کیا سگی کو اسی نے ٹھکانے لگایا ہے تو وہ فوراً تسلیم کر لے گا کہ ہاں...... یہ اسی کا کارنامہ ہے؟''

''نہیں جناب! اگر مشتاق پٹواری سگی کے قتل میں ملوث ہے تو وہ اتنی آسانی سے زبان

نہیں کھولے گا۔ہمیں طریقے سلیقے سے تفتیش کر کے اس کی زبان سے اگلوانا ہوگا۔''

''وہ تو آج شام تک گوجرانوالہ سے واپس آئے گا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''لیکن ہم اس کے انتظار میں شام کا انتظار نہیں کر سکتے۔تفتیش تو ابھی اور اسی وقت شروع ہوگی۔۔۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور اس تفتیش کا آغاز تم کرو گے امانت علی......!''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔''مم...... میں......؟''

''ہاں' تم!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''تم سعید نگر ہی کے رہنے والے ہو لہٰذا تمہارے لئے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔تم اپنے تئیں یہ جاننے کی کوشش کرو کہ ان دنوں مشتاق پٹواری کے گھر کے اندر کیا حالات چل رہے تھے' خصوصاً سگی کے حوالے سے......!''

''آپ بے فکر ہوجائیں ملک صاحب!'' وہ بڑے عزم سے بولا۔''میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں' مجھے کرنا کیا ہے۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

آئندہ بیس منٹ تک میں کانسٹیبل امانت علی کو سگی کی موت اور پٹواری مشتاق کے ملوث ہونے کے حوالے سے مختلف نوعیت کی ہدایات دیتا رہا۔ میرے ذہن کو صبح سے جو نقطہ پریشان کئے ہوئے تھا وہ اب ابھر کر سامنے آچکا تھا جبھی میری سرگرمی میں بھی خاصی تیزی آگئی تھی۔



آج کے مقابلے میں ہمارے زمانے میں تفتیش کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہوا کرتی تھیں۔ہم لوگ پوچھ گچھ کے روایتی طریقوں پر ہی انحصار کیا کرتے تھے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کامیابی کا تناسب ہمارے زمانے میں آج کی نسبت کہیں زیادہ ہوا کرتا تھا۔مجرم تک رسائی حاصل کرنے کے سلسلے میں فنگر پرنٹس بھی ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے دور میں فنگر پرنٹس کا رواج بھی عام نہیں ہوا تھا۔اگر کوئی تفتیشی افسر اس جانب توجہ دیتا بھی تھا تو عدالت اس کی محنت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی۔سگی کی حیرت ناک موت کا عقدہ حل کرنے کیلئے اگر فنگر پرنٹس کا سہارا لیا جاتا تو بہت سے سنسنی خیز انکشافات ہو سکتے تھے۔

رات میں تھانے سے اٹھنے ہی والا تھا کہ پتا چلا' پٹواری مشتاق مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

پٹواری کی عمر پچپن کے قریب رہی ہوگی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک میانہ قد شخص تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ میں نے اسے اپنی میز کی دوسری جانب رکھی کرسی پر بیٹھنے کیلئے کہا۔

بیٹھنے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا۔''تھانیدار صاحب! یہ سب کیسے ہوگیا؟''

''یہ سب'' سے اس کی مراد یقیناً سگی کی المناک موت ہی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''پٹواری جی! یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے۔سگی آپ کے ساتھ رہتی تھی؟''

''میں تو کل دوپہر میں اسے بھلی چنگی گھر میں چھوڑ کر گیا تھا۔'' وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔''آج واپس آیا ہوں تو یہاں کی صورتحال ہی بدلی ہوئی ہے۔''

''آپ سگی کی موت کے حوالے سے کیا کہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کیا کہوں جی۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا' پھر بڑی بے چارگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں' اس کے دماغ میں خودکشی کا خیال کیوں آیا......؟''

''کیا آپ بھی یہی سمجھ رہے ہیں کہ سگی نے خودکشی کی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں...... مجھے زلیخا نے یہی بتایا ہے۔'' وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

''زلیخا نے بتایا اور آپ نے یقین کرلیا؟'' میرے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

''جناب! آپ کو پتا ہے' میں تو کل سے گوجرانوالہ گیا ہوا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ زلیخا نے مجھے بتایا ہے کہ سگی نے چھت سے لٹک کر جان دے دی ہے۔''

''ہوں......'' میں بدستور معنی خیز انداز میں اسے گھورتا چلا گیا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب! آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ سگی نے خودکشی نہیں کی......؟''

''ہاں' میں ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں سگی کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے......''

''ایسا کون کرسکتا ہے؟'' اس نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

''یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہئے پٹواری صاحب......!''

''اس گھر میں سگی کا کوئی دشمن نہیں ہے۔'' وہ خاصے سراسیمہ اور گھمبیر انداز میں بولا۔ ''سب اس کا بہت خیال رکھتے تھے' اسے ذرا سی بھی تکلیف پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے کجا یہ کہ...... اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔''

''میں جس انداز میں سوچ رہا ہوں اس کی کلی وضاحت تو پوسٹمارٹم کی رپورٹ آنے پر ہی ہوگی۔'' میں نے پٹواری مشتاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا' پھر ٹٹولنے والے لہجے میں پوچھا۔

''پٹواری جی! آپ اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں نا کہ سگی اپنی جان گنوا بیٹھی ہے؟''

''جی ہاں...... اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں۔'' وہ جلدی سے تائیدی انداز میں بولا۔

''اگر میں آپ کی بات ہی کو درست مان لوں کہ سگی نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی ہے پھر ایک نہایت ہی خطرناک سوال سر اٹھاتا ہے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''جب میں آپ کی بات مان رہا ہوں تو اس سوال کا جواب دینا بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔''

''آپ سوال کریں تھانیدار صاحب۔'' وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں ضرور جواب دوں گا۔''

''سوال بہت آسان اور سادہ سا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کوئی بھی انسان راضی خوشی یا چاؤ میں اپنی جان سے نہیں کھیلتا۔ جب تک کوئی دکھ' کوئی پریشانی انسان کو زندگی سے مایوسی کی حد تک ناامید نہ کردے وہ خودکشی جیسے خطرناک فعل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے معنی خیز نظر سے پٹواری کو دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''سگی کی زندگی میں ایسا کون سا دکھ' ایسی کون سی پریشانی تھی جس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی......؟''

''یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آرہی ملک صاحب۔'' وہ سخت الجھن کے عالم میں بولا۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جو بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی اسے ہم پوسٹمارٹم رپورٹ کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔''

وہ زبان سے کچھ نہیں بولا' پریشان نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کل کتنے بجے سعید نگر سے گوجرانوالہ کیلئے روانہ ہوئے تھے؟''

''دوپہر کا کھانا کھا کر میں گھر سے نکلا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس وقت دو بجے تھے۔''

''جب آپ گھر سے رخصت ہوئے تو سگی صحیح سلامت تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ ''گوجرانوالہ آپ کس کے پاس گئے تھے؟''

''ملک امین کے پاس'' اس نے بتایا۔

‘‘لگتا ہے' ملک امین کے ساتھ آپ کی خاصی گہری دوستی ہے۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘اسی لئے آپ نے پچھلی رات اور آج دن کا بیشتر حصہ اس کے ساتھ گزارا ہے۔’’

‘‘آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔’’ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ‘‘ملک امین بہت ہی بھلے مانس اور گوجرانوالہ کی ایک معروف شخصیت ہے۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کئی مقابلے بھی لڑ چکا ہے۔’’

‘‘مقابلے لڑ چکا ہے......’’ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ‘‘کس چیز کے مقابلے پٹواری صاحب......؟’’

ملک امین کا نام میں نے پہلے بھی سن رکھا تھا لیکن فوری طور پر میرے ذہن میں نہ آیا کہ میں کس حوالے سے اسے جانتا تھا اسی لئے پٹواری مشتاق سے سوال کی ضرورت بھی پیش آئی تھی۔ وہ بولا۔ اس کی آواز میں سرسراہٹ تھی۔

‘‘ویٹ لفٹنگ کے مقابلے جناب......!’’

مجھے فوراً یاد آ گیا کہ ملک امین ایک مڈل ویٹ' ویٹ لفٹر تھا جو پاکستان کے علاوہ بیرون ملک جا کر بھی ویٹ لفٹنگ کے کئی مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا اور ان مقابلوں کے حوالے سے اس کے پاس کئی اعزازات بھی تھے۔ وہ ایک معروف باڈی بلڈنگ اینڈ ویٹ لفٹنگ کلب کا روح رواں بھی تھا۔ مذکورہ کلب گوجرانوالہ کے شیرانوالہ باغ میں واقع تھا۔

‘‘تو ملک امین کے ساتھ آپ کی گہری دوستی ہے؟’’ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

‘‘جی...... جی ہاں......’’ وہ بڑے فخر سے بولا۔

میں نے پٹواری مشتاق سے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں' پھر گفتگو کا رخ ایک خاص جانب موڑ دیا۔ اس رخ پر اس کے بڑے بھائی کرم دین کا انتقال' اس کی بھاوج خورشید کا پاگل پن اور بعدازاں پراسرار گمشدگی' اس کا اپنا مکان بیچ کر بھائی کے بڑے گھر میں ڈیرہ ڈال دینا' کرم دین کی پچیس ایکڑ اراضی کو اپنے تصرف میں لے آنا اور سگی کی اچانک خودکشی ایسے تمام موضوعات شامل تھے۔

پٹواری نے نہایت ہی تحمل اور توجہ سے میری بات سنی اور میرے ہر سوال کا جواب ایسے پیرائے میں دیا جس سے اس کی انسان دوستی' اخلاص اور ہمدردی جھلکتی تھی۔ اس نے یہ تمام تر

قربانیاں اپنی بھتیجی اور بھابی کی بھلائی اور بہتری کیلئے دی تھیں۔

میں نے اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر لوگوں کی اس کے بارے میں مخصوص رائے سے آگاہ کیا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ خاصی برہمی سے بولا۔

‘‘ایسی باتیں میں نے بھی سنی ہیں لیکن یہ باتیں بنانے والے گیدڑوں کی طرح پیٹھ پیچھے زہر اگلتے ہیں۔ کوئی مرد کا بچہ سامنے آ کر مجھ سے سوال نہیں کرتا۔ اب چھپ کر بولنے والوں کی زبان تو نہیں پکڑی جا سکتی نا......’’ وہ لمحاتی توقف کے بعد خاصے جذباتی لہجے میں بولا۔

‘‘میں اگر چاہتا تو کرم دین کی پچیس ایکڑ زرعی اراضی کو چپ چپاتے اپنے نام منتقل کر لیتا۔ ایک پٹواری کیلئے یہ بہت آسان کام تھا' یہی کام میں مکان کے سلسلے میں بھی کر سکتا تھا لیکن میں نے کسی لالچ یا سازش کے تحت خورشید اور سگی کی ذمہ داری نہیں اٹھائی تھی۔ میرے دل میں ان کیلئے سچی ہمدردی تھی۔ آپ چاہیں تو مکان اور زمین کے کاغذات چیک کر سکتے ہیں۔’’

‘‘اس کی ضرورت نہیں پٹواری جی۔’’ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ‘‘مجھے آپ کی بات پر پورا بھروسہ ہے۔’’

‘‘لوگوں کو تو باتیں بنانے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔’’ وہ بدستور خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ‘‘کوئی اچھا کرے تو انہیں تکلیف' کوئی برا کرے تو انہیں پریشانی۔ کرم دین کی وفات کے بعد میں نے خورشید اور سگی کیلئے جو کچھ بھی کیا اس میں میری نیک نیتی اور خلوص شامل تھا۔ میرا اللہ' میری نیت اور دل کے حال کو جانتا ہے۔ مجھے لوگوں کی باتوں اور ان کے خیالات کی کبھی پروا تھی اور نہ ہی اب کوئی پروا ہے۔’’

‘‘میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں پٹواری جی۔’’ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ‘‘لیکن سگی کی موت کے بعد صورتحال تبدیل ہو گئی ہے۔’’

‘‘کیا تبدیل ہو گئی ہے؟’’ اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

‘‘یہ پچیس ایکڑ زرعی اراضی اور وسیع و عریض شاندار مکان اب آپ کے رحم و کرم پر ہے۔’’ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

‘‘رحم و کرم پر...... میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟’’ اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

‘‘مطلب یہ کہ اب اس زمین جائیداد کے مالک و مختار آپ ہی ہیں۔’’ میں نے بدستور

معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور وہ بھی بلاشرکت غیرے......!''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' وہ اچھل پڑا۔

''قصور آپ کا ہے یا نہیں' یہ ایک الگ بحث ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''لیکن باتیں بنانے والوں کے منہ ممکنہ حد تک کھل جائیں گے کہ بھئی...... اب تو پٹواری مشتاق کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوگا۔''

''ملک صاحب! میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے نا......'' وہ نہایت ہی مستحکم انداز میں بولا۔ ''مجھے کسی کے کچھ بھی کہنے کی ذرا پروا نہیں ہے۔ میں نے مر کر جس ذات کو منہ دکھانا ہے وہ سب جانتا ہے۔''

میں نے مزید چند سوالات کے بعد اس سے کہا۔ ''پٹواری جی! آپ جانتے ہیں کہ میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں۔ میرے تھانے کی حدود میں ایک جوان اور کنواری لڑکی نے خودکشی ہے لہٰذا یہ تحقیق اور تفتیش میرے فرائض کا حصہ ہے۔ مجھے امید ہے اس سلسلے میں آپ مجھ سے بھرپور تعاون کریں گے۔

''میں ہر قسم کے تعاون کیلئے تیار ہوں ملک صاحب۔'' وہ بڑے جوش سے بولا۔ ''آپ حکم کریں جناب......''

''فی الحال تو آپ گھر جا کر افراد خانہ میں سے کسی سے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بظاہر خوش باش اور مطمئن دکھائی دینے والی سگی کے اندر ایسا کون سا کرب پنہاں تھا جس نے اسے خودکشی جیسے فعل پر مجبور کر دیا' اگر واقعی اس نے خودکشی کی ہے تو......!'' میں نے بڑے معنی خیز انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر بات کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اور اگر...... میرے شک کے مطابق' اس نے خودکشی نہیں کی بلکہ اس کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے تو پھر یہ پتا لگانے کی ضرورت ہے کہ اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟''

''آپ کی ہدایت کے مطابق یہ جاننے کی کوشش ضرور کروں گا لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ آپ کے شک کی بنیاد کیا ہے......؟'' اس نے بے حد الجھی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھا۔

''پٹواری جی!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''ایک آدھ دن صبر کر لیں' پوسٹمارٹم کی رپورٹ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دے گی۔''

''پتا نہیں' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''کوئی اس کی جان کا دشمن کیوں کر ہو سکتا ہے......؟''

''حقیقت جو بھی ہے وہ بہت جلد کھل کر سامنے آ جائے گی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ کے ذمہ جو کام لگایا ہے بس اس پر دھیان دیں اور نتیجہ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''اچھا جی......'' اس نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے میری بات اس کے حلق سے نہ اتری ہو۔

میں جانے کیلئے کھڑا ہوا تو وہ بھی میری تقلید میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''پٹواری جی! آپ بالکل مطمئن ہو کر جائیں۔ اگر آپ کی بھتیجی نے واقعی خودکشی کی ہے تو میں اس کے اس سنگین اقدام کا سبب ضرور جان کر رہوں گا اور اگر اس کی موت کا معاملہ میرے شک کے مطابق ہے تو پھر آپ بہت جلد اس کے ذمہ داروں کو میری گرفت میں دیکھیں گے۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے مزید کہا۔ ''پٹواری جی! میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور جلد از جلد اس معمے کو حل کرنے کا متمنی بھی۔ امید ہے' اس سلسلے میں مجھے آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔''

''جی ہاں ضرور......'' اس نے پر وثوق انداز میں کہا' پھر پوچھا۔ ''سگی کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی؟''

''کل شام تک یا...... زیادہ سے زیادہ پرسوں صبح۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ اسی حساب سے اس کے کفن دفن کا بندوبست کرنا۔''

''جی...... بہت اچھا!'' اس نے کہا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد تھانے سے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ فروری کا مہینہ تھا۔ موسم سرما

رخصت ہونے کو تھا' تاہم ابھی بھی صبح وشام فضا میں اچھی خاصی خنکی موجود ہوتی تھی۔ پٹواری مشتاق لگ بھگ ساڑھے چھ بجے مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے کم وبیش پونا گھنٹہ میرے ساتھ گزارا تھا۔ جب وہ رخصت ہوا تو رات پوری طرح اپنے پَر پھیلا چکی تھی۔

میں رات کے کھانے اور نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر سونے کیلئے لیٹا تو اس وقت بھی سگی ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی موت میرے ذہن میں ابھی تک کسی معمے کی مانند تھی۔ وہ سیدھا سادا خودکشی کا کیس تو ہرگز نہیں تھا۔ ابھی تک میں نے بشمول پٹواری مشتاق لوگوں سے جو بھی پوچھ گچھ کی تھی اس میں کوئی بھی ایسی بات نکل کر سامنے نہیں آئی تھی جو میرے شک کو تقویت پہنچاتی لہٰذا مجھے پوسٹمارٹم کی رپورٹ کا انتظار کرنا تھا۔

میں نے اسی حوالے سے پٹواری مشتاق کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ اس کے ساتھ میری جو بھی گفتگو ہوئی تھی اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی سگی کی موت والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا' تاہم میں اس کے بیان کو چیک کئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ ملک امین گوجرانوالہ کا ایک مشہور ومعروف ویٹ لفٹر تھا اور بین الاقوامی شہرت کا حامل بھی۔ وہ اس امر کی تصدیق کر سکتا تھا کہ پٹواری مشتاق گزشتہ روز کتنے بجے اس کے پاس پہنچا تھا اور آج کتنے بجے وہاں سے رخصت ہوا تھا۔

میں اس رات صغریٰ عرف سگی کی حیرت ناک موت کی بھول بھلیوں میں چکراتے ہوئے نیند کی وادی تک جا پہنچا' پھر اگلی صبح ہی میری آنکھ کھلی تھی۔



بعض معاملات میں میری چھٹی حس بہت عمدہ کام دکھاتی ہے۔ میں اس کی غیر محسوس اور بے آواز پکار کو نظر انداز نہیں کیا کرتا۔ سگی کی خودکشی نما موت کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ گیارہ فروری کی صبح تھی جب میں صابر علی اور ایوب کی اطلاع پر پٹواری مشتاق کے گھر پہنچا تھا جہاں ایک کمرے میں سگی چھت سے لٹکی ہوئی پائی گئی تھی۔ ظاہر یہ سیدھا سادا سا خودکشی کا کیس تھا لیکن میرا ذہن شروع ہی میں کھٹک گیا تھا۔ بعدازاں کانسٹیبل امانت علی کے تائیدی بیان نے اس کھٹک پر روشنی بھی ڈالی تھی اور اب پوسٹمارٹم کی رپورٹ میرے تمام تر خدشات کی تصدیق فرما رہی تھی۔

سگی کی پوسٹمارٹم لاش ابتدائی رپورٹ کے ساتھ تیرہ فروری کی صبح ہسپتال سے واپس آئی

تھی اور یہ رپورٹ بڑی تہلکہ خیز تھی جس نے میرے تمام تر خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق سگی کی موت دس اور گیارہ فروری کی درمیانی شب نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس کی موت کا سبب پھانسی نہیں تھی۔

جی ہاں...... پوسٹمارٹم رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا کہ اس کی موت زہر خورانی کے باعث واقع ہوئی تھی۔ اس کے معدے کے کیمیکل ٹیسٹ سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ اسے کوئی زود اثر زہر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔

یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز تھا اور میرے کھٹکے کی مکمل تصدیق کرتا تھا۔ اس نے خود زہر کھایا تھا یا اسے زہر دیا گیا تھا' ہر دو صورت میں اس کی موت کا سبب زہر خورانی ہی تھا اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر جان نہیں دی۔ پوسٹمارٹم کی رپورٹ میں اس بات کی وضاحت موجود تھی کہ جب سگی کو پھانسی دی گئی تو وہ زندگی کی قید سے مکمل طور پر آزادی حاصل کر چکی تھی یعنی پھانسی والے معاملے سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔

اس انکشاف سے یہ ایک بات بھی ثابت ہوتی تھی کہ سگی خود اپنی موت کی ذمہ دار نہیں تھی۔ یہ کام کسی اور کا تھا مگر کس کا......؟ مجھے یہی پتا چلانا تھا' کسی نے اسے زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا اور پھر پھانسی پر ٹانگ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔

اسی رپورٹ میں سب سے زیادہ سنسنی خیز جو بات درج تھی وہ انکشاف انگیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔ میری تمام تر معلومات کے مطابق سگی غیر شادی شدہ تھی' لیکن رپورٹ چیخ چیخ کر اس امر کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ تین ماہ کی امید سے تھی۔ اس انکشاف نے میرے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور میں بیک وقت کئی زاویوں پر سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میری سوچ میں مختلف سوالات سر اٹھا رہے تھے۔

اگر سگی شادی شدہ نہیں تھی تو پھر اس کے پیٹ میں کس کے گناہ کا پھل پل رہا تھا؟ کیا سگی نے اس پھل کے ساتھ ہی خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا؟ کیا اس گناہ کے ذمہ دار نے کسی بہانے سگی کو زہر دے دیا تھا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری؟

ایک بات تو طے تھی کہ اگر سگی نے خود کو موت کے حوالے کیا ہوتا تو پھر پھانسی پر جا لٹکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ تمام تر حالات وواقعات کی روشنی میں فی الحال یہی سمجھ میں آ رہا

تھا کہ سگی اپنی موت کی خود ذمہ دار نہیں تھی بلکہ یہ کسی اور کا کارنامہ تھا اور اسی شخص نے سگی کو پھانسی پر لٹکا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ بہرحال پوسٹمارٹم کی رپورٹ آنے کے بعد بہت سی باتیں واضح ہوگئی تھیں لہٰذا میں بڑی سہولت سے تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھا سکتا تھا۔

میں نے پٹواری مشتاق کو تھانے بلا لیا۔ وہ یہی سوچ کر میرے پاس آیا تھا کہ میں سگی کی لاش اس کے حوالے کرنے والا ہوں۔ ظاہر ہے' مجھے سگی کی لاش تو اس کے سپرد کرنا ہی تھی لیکن اس سے پہلے ایک انتہائی سنجیدہ میٹنگ بھی ضروری تھی۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ نڈھال سا اندر آیا اور میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''ملک صاحب! کیا میں سگی کی لاش کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟''

''بالکل لے جا سکتے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں آپ سے چند اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

میرے گھمبیر انداز کو دیکھتے ہوئے وہ چونکا' پھر تشویش بھرے انداز میں پوچھنے لگا۔

''تھانیدار صاحب! خیریت تو ہے نا......؟''

''خیریت نہیں ہے پٹواری جی...!''

''کیا سگی کی خودکشی کا سبب سامنے آ گیا؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔

''خودکشی نہیں' قتل پٹواری جی......!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''قت......قتل......'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔ ''یہ آپ کیا...... کہہ رہے ہیں؟''

''میں حقیقت بیان کر رہا ہوں پٹواری جی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پوسٹمارٹم کی رپورٹ بیان کرتی ہے کہ سگی کو ایک خطرناک زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور بعدازاں اس کی لاش کو چھت سے لٹکا کر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔''

''یہ...... یہ آپ......کیا کہہ رہے ہیں۔''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پوسٹمارٹم کی رپورٹ میں ایک ایسا انکشاف بھی درج ہے جسے سن کر آپ کے دماغ

کے پرخچے اڑ جائیں گے۔''

''کک...... کیسا انکشاف......؟'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے آئندہ پانچ منٹ میں نہایت ہی نپے تلے اور مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اسے حالات کی سنگین صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مریل سی آواز میں بولا۔

''یہ...... یہ کیسے...... ہو گیا......؟''

''یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہئے پٹواری جی......؟''

''آپ مجھ سے...... بڑی سے بڑی قسم لے لیں ملک صاحب......'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''آپ کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا پٹواری جی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹمارٹم کی رپورٹ نے حقیقت کھول دی ہے جسے جھٹلایا یا بدلا نہیں جا سکتا۔''

''اگر...... یہ بات گاؤں والوں کو پتا چل گئی تو...... میری عزت خاک میں مل جائے گی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''کاش! زمین پھٹ جائے اور میں اس میں دفن ہو جاؤں۔''

''آپ کے زمین میں دفن ہونے سے بات نہیں بنے گی پٹواری جی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب پوسٹمارٹم کی رپورٹ سگی کی موت کو ایک قتل قرار دے رہی ہے تو مجھے اپنی تفتیش کے ذریعے سگی کے قاتل تک پہنچنا ہوگا۔''

''اور اس تفتیش میں......!'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر وحشت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''پٹواری جی! آپ ایک عزت دار آدمی ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ اپنی تفتیش کے دوران میں آپ کی عزت کی ممکنہ حد تک حفاظت کروں۔''

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا تھانیدار صاحب۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''اس میں احسان والی کوئی بات نہیں پٹواری جی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک سخت گیر تھانیدار کے ساتھ ایک ہمدرد دل رکھنے والا انسان بھی ہوں۔ میں اس کیس میں آپ کی نازک پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔''

"یہ آپ کا بڑا پن ہے جناب۔" وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔ "آپ بہت عظیم انسان ہیں۔"

میں نے اس کے خیالات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کہا۔ "مجھے امید ہے، آپ اس کیس کو حل کرنے کے سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کریں گے۔ میں آپ کے تعاون کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

"آپ حکم کریں، میں ہر خدمت کیلئے حاضر ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ "کیا آپ سگی کے ایسے کسی معاملے سے واقعی واقف نہیں ہیں، پوسٹمارٹم کی رپورٹ جس جانب اشارہ کر رہی ہے......؟"

"آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں، اگر مجھے ذرا بھی سن گن ہو۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "اگر ایسی کوئی بات میرے علم میں ہوتی تو میں اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے نمٹا لیتا۔ سگی کی جان نہ جاتی۔"

"اب یہ بات کسی شک و شبے کی محتاج نہیں رہی کہ سگی کی لاش کو پھانسی پر لٹکا کر خودکشی کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔" میں نے مشتاق پٹواری کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "مردہ سگی اپنی مرضی اور کوشش سے تو پھانسی نہیں لگا سکتی نا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی طے ہے کہ......" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جس کسی شخص نے بھی سگی کی لاش کو پھانسی دی ہے اس کا تعلق آپ کے گھر کے ساتھ بہت ہی گہرا ہے۔"

"یہ...... یہ نہیں ہو سکتا...... ملک صاحب......" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"یا پھر......" میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "یا پھر اسے آپ کے گھر کے اندر سے کسی کی پوری حمایت حاصل رہی ہے ورنہ......" میں چند سیکنڈ کیلئے رکا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ورنہ یہ کام ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کی بیوی زلیخا کے بیان کے مطابق وقوعہ کی رات گھر کے تمام افراد نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھایا تھا، پھر دیر تک ان میں مختلف نوعیت کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے کمرے میں سونے کیلئے چلے گئے تھے،

پھر جب صبح سگی اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی تو زلیخا کو اس خلاف معمول بات پر شدید حیرت ہوئی۔ اس نے سگی کے کمرے میں جا کر صورتحال کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو یہ انکشاف ہوا کہ اس نے چھت سے لٹک کر خودکشی کر لی ہے۔ زلیخا نے میرے سوالات کے جواب میں یہ بھی بتایا تھا......" میں سانس درست کرنے کیلئے تھما، ٹٹولنے والی نظر سے مشتاق پٹواری کو دیکھا، پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"زلیخا نے بڑے یقین کے ساتھ مجھے بتایا تھا کہ رات کو اس نے گھر کے بیرونی دروازے کو بند کر کے اندر سے کنڈی لگائی تھی اور صبح جب وہ بیدار ہوئی تو کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ جس بھی شخص نے سگی کی لاش کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا تھا اسے گھر کے کسی فرد کی مکمل حمایت اور مدد حاصل رہی ہے اور وہ شخص یہ بھی جانتا تھا کہ سگی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ اب آپ فرمائیں، کیا کہتے ہیں...... بیچ اس مسئلے کے......؟"

"میں آپ کی بیان کردہ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا جناب......" وہ شکستہ انداز میں بولا۔ "لیکن یہ باتیں میرے ذہن میں جگہ بھی نہیں بنا پا رہیں۔ میں اپنے گھر کے سبھی افراد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے بچے اور بیوی سگی سے بہت محبت کرتے تھے، اس کا ہر لحاظ سے بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی سگی سے ایسی بھیانک دشمنی نہیں کر سکتا۔ میں تو......"

"ایوب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"ایوب...... میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔

ایوب، پٹواری مشتاق کا بڑا بیٹا تھا، جس کی عمر پندرہ سال کے قریب تھی لیکن اپنی صحت اور قد کاٹھ کے حوالے سے وہ اٹھارہ سال کا لگتا تھا۔ یہی نوجوان دو روز پہلے صابر علی کے ساتھ اس اندوہناک واقعہ کی اطلاع دینے میرے پاس تھانے آیا تھا۔ ایوب کے ذکر پر پٹواری بری طرح چونکا تو میں نے کہا۔

"کیا ایوب، سگی کے ساتھ ملوث نہیں ہو سکتا؟"

میں نے یہ سوال ایک خاص زاویے سے کیا تھا۔ پٹواری فوراً میری بات کی تہ میں پہنچ گیا اور بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب......!"

"آپ کے اس وثوق کا کوئی خاص سبب؟"

"ایوب، سگی سے آٹھ نو سال چھوٹا ہے جناب۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ تو سگی کو لغہ کی طرح اپنی بڑی بہن سمجھتا تھا۔"

"لغہ، ایوب کی سگی بہن ہے، مگر سگی اس کی تایازاد تھی۔" میں نے رشتوں کے ایک انتہائی نازک پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ لاکھ سگی کو اپنی بہن سمجھتا رہے لیکن وہ اس کیلئے نامحرم ہی تھی یعنی ان دونوں کے بیچ ایسا کوئی معاملہ ممکن ہے جس کی نشاندہی پوسٹمارٹم کی رپورٹ میں کی گئی ہے......" میں نے رک کر ایک گہری سانس لی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جوانی آگ اور پٹرول کا کھیل ہے۔ اسے بارود اور ماچس سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ دو نامحرم جوان لڑکی اور لڑکے کے درمیان کوئی بھی گل کھل سکتا ہے۔ آپ تو ماشاللہ جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ میری باتوں کی تردید نہیں کریں گے۔"

"میں واقعی آپ کی باتوں کی تردید نہیں کروں گا کیونکہ آپ نے انسانی فطرت اور جوانی کی حقیقت کی بات کی ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن مجھے اپنی اولاد پر بھی مکمل بھروسہ ہے۔ میں اس انداز سے کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"مگر اب سوچنے کی ضرورت ہے پٹواری جی۔" میں نے اصراری انداز میں کہا۔ "حقیقت حال آپ کے سامنے ہے۔ میں تحقیق اور تفتیش کی گاڑی کو کسی بھی قیمت پر روک نہیں سکتا۔ پوسٹمارٹم کی رپورٹ میں جو بھی چھوٹے بڑے انکشاف ہوئے ہیں وہ اب اس واقعہ کے ریکارڈ کا حصہ بن چکے ہیں۔ مجھے اپنے اعلیٰ افسران کو بھی جواب دینا ہے۔ مجھے امید صورتحال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے آپ مجھ سے حتی المقدور تعاون کریں گے۔"

"آپ نے میری عزت کا پردہ رکھنے کا وعدہ کیا ہے ملک صاحب۔" وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں آپ سے ہر ممکن تعاون کروں گا۔ میں غیر محسوس انداز میں زلیخا کو ٹٹولنے کی کوشش کرتا ہوں......"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں پٹواری جی۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ ایوب ہی سگی کے ساتھ ملوث رہا ہو۔ وہ کوئی باہر کا آدمی بھی ہوسکتا ہے۔ ایک بار مجھے

اس شخص کا سراغ مل جائے، باقی کے معاملات میں خود ہی حل کرلوں گا۔"

"جی، میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے کام آسکوں۔" وہ خلوص نیت سے بولا۔

میں نے کہا۔ "پٹواری جی! آپ سگی کی لاش کو لے جائیں اور اس کی تدفین کا بندوبست کریں اور جیسے ہی کوئی خاص بات پتا چلے، آپ فوراً میرے پاس آئیں گے۔"

اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔ میں نے ضروری کارروائی کے بعد سگی کی لاش اس کے حوالے کردی۔



میں نے پٹواری مشتاق کے ساتھ خاصا نرمی کا برتاؤ کیا تھا اور اسے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے سچا اور کھرا آدمی نظر آیا تھا۔ میں نے اپنے عملے کا ایک آدمی گوجرانوالہ روانہ کر کے پٹواری کے بیان کی تصدیق بھی کرالی تھی کہ وہ ملک امین کے پاس کتنا وقت گزار کر آیا تھا۔ پٹواری کی ذات شک و شبے سے بالاتر ثابت ہوئی تھی۔ یہ سب تو ٹھیک تھا لیکن خرابی والی بات یہ تھی کہ میں ابھی تک سگی کی پراسرار موت کا معمہ حل نہیں کر پایا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر پٹواری کے گھر جا کر زلیخا' ایوب اور نغمہ سے خاصی تفصیلی بات چیت کی تھی' مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا تھا۔

یہ سگی کی تدفین کے دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ میں تھانے میں بیٹھا اسی گھمبیر مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ مجھے صابر علی کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ صابر علی وہ دراز قامت اور دبلا پتلا شخص تھا جو سگی کی خودکشی کی خبر لے کر ایوب کے ہمراہ میرے پاس آیا تھا۔ وہ پٹواری مشتاق کا پڑوسی بھی تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ دھوپ رخصت ہو چکی تھی۔ اب تب میں اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد صابر علی میرے سامنے موجود تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بھرے بھرے جسم کی مالک ایک سانولی سلونی عورت بھی تھی۔ میں نے انہیں بیٹھنے کیلئے کہا' پھر سوالیہ نظر سے صابر علی کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''یہ میری گھر والی رضیہ ہے جی۔'' اس نے اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ہم دونوں گاؤں والوں کی نظر بچا کر آپ کے پاس آئے ہیں جناب......''

رضیہ کا نام سنتے ہی مجھے فوراً یاد آ گیا کہ میں نے صابر علی کو ایک اہم کام سونپا تھا' وہ کام

اس نے اپنی بیوی رضیہ کی مدد سے کرنا تھا۔ پچھلے دو دن ایسی افراتفری میں گزرے تھے کہ رضیہ کی طرف میرا دھیان ہی نہیں جا سکا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ مجھ سے ملنے آئے تھے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔

''تم لوگ گاؤں والوں کی نظر بچا کر میرے پاس آئے ہو تو اس کا یہی مطلب ہے کہ تمہارے پاس کوئی اہم اطلاع ہے؟'' میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ایسی ہی بات ہے تھانیدار صاحب۔'' صابر علی خاصے جوش سے بولا۔ ''میں نے آپ کو بتایا تھا نا' رضیہ کھوج کھرا لگانے والے کاموں کی بڑی ماہر ہے۔''

''ہاں بتایا تھا......'' میں نے گہری نظر سے رضیہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہاں بھئی رضیہ! تم نے کیا کھوج کھرا نکالا ہے......؟''

رضیہ دیکھنے میں ایک عام سی دیہاتن نظر آتی تھی تاہم اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی۔ یہ چمک ان لوگوں کے چہرے اور آنکھوں میں دیکھنے کو ملتی ہے جن کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کرتا ہو۔ وہ عام دیہاتی عورت ہونے کے ساتھ خاصی پرکشش بھی تھی۔ میں سوال کر کے خاموش نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

جواب دینے سے پہلے اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ صابر علی جلدی سے بولا۔ ''رضیہ نے سگی کے چکر کا پتا چلا لیا ہے جناب......''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کیسا چکر......؟''

میں نے چونکہ یہ سوال براہ راست رضیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کیا تھا لہٰذا جواب بھی اسی نے دیا۔

''تھانیدار صاحب! میں نے بڑی بوڑھیوں سے سن رکھا ہے کہ مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہئے' پر جو سچ ہے' وہ سچ ہے اور پھر...... یہ آپ ہی کا حکم تھا کہ دیوار کے اس پار کے حالات کا اندازہ لگانا ہے......'' لمحے بھر کو رک کر اس نے ایک گہری سانس لی' پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ قانون کی مدد کے خیال سے کیا ہے جی۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو رضیہ۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''سگی کی

موت جن حالات میں ہوئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کے بارے میں مکمل تفتیش کی جائے۔ اس قانونی تقاضے کو نبھانے میں کوئی برائی یا گناہ نہیں ہے۔''

وہ میری وضاحت کے بعد خاصی مطمئن دکھائی دینے لگی۔ صابر علی بھی میری بات کی تائید میں سر کو اثباتی جنبش دینے لگا۔ میں دوبارہ رضیہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''اب جلدی سے سگی کے چکر کے بارے میں مجھے بتا دو؟''

''مجھے پتا چلا ہے جناب......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ ''پچھلے سات' آٹھ ماہ سے سگی اور بشارت جٹ میں چکر چل رہا تھا۔''

''بشارت جٹ......!'' میں تقریباً اچھل پڑا۔ ''یہ کون ہے؟''

سگی کے کسی مرد کے ساتھ چکر کا سن کر میرا دھیان آپوں آپ پوسٹمارٹم کی رپورٹ کی جانب چلا گیا تھا اور اس کیس کی کڑیاں ایک ایک کر کے منسلک ہوتی دکھائی دینے لگی تھیں۔ میں نے بشارت جٹ کے بارے میں جتنی شدت سے سوال کیا تھا اس نے ان دونوں میاں بیوی کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

صابر علی نے بتایا ''بشارت جٹ' شوکت جٹ کا بڑا بیٹا ہے جناب۔''

''کیا یہ لوگ بھی موضع سعید نگر ہی میں رہتے ہیں؟''

''بالکل جناب!'' صابر علی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''شوکت جٹ یہاں کا ایک چھوٹا زمیندار ہے اور اس کا گھر ہمارے گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر ہے۔''

''تم سے دو گلیوں کے فاصلے کا مطلب ہے' سگی کے گھر سے بھی دو گلیوں کا فاصلہ۔'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ظاہر ہے جی......ہم اور پٹواری جی پڑوسی ہی تو ہیں۔''

''بشارت جٹ کی عمر کیا ہوگی؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہی کوئی چھبیس ستائیس سال۔'' صابر علی نے جواب دیا۔

''کیا بشارت جٹ شادی شدہ ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

صابر نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔''

''رضیہ تم نے بتایا ہے کہ پچھلے سات آٹھ ماہ سے سگی اور بشارت جٹ میں کوئی چکر چل رہا تھا۔'' میں نے صابر علی کی بیوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس چکر کی کچھ

وضاحت کرو گی؟''

''وضاحت کیا کروں جی۔ آپ خود سیانے ہیں۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ ''وہ چکر تھا...... عاشقی معشوقی والا۔''

''تمہارا مطلب ہے' وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے تھے......؟''

میں نے ابھی تک ان میاں بیوی کو پوسٹمارٹم کی رپورٹ کے نازک ترین حصے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی ایسا کوئی ارادہ رکھتا تھا کیونکہ میں پٹواری مشتاق سے اس کی عزت رکھنے کا وعدہ کر چکا تھا اور میری حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ اپنے وعدے کو نبھاؤں۔ کوئی تفتیشی رکاوٹ آڑے آ جاتی تو دوسری بات تھی۔

''جی ہاں...... بالکل......'' رضیہ نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔ ''میرا بھی مطلب ہے تھانیدار جی......''

''کیا ان کے عشق کا معاملہ گاؤں والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...... یہ کام وہ بڑا چھپ چھپا کر کر رہے تھے۔'' رضیہ نے بتایا۔

''پھر تم نے کیسے ان کے کارنامے کا سراغ لگا لیا رضیہ؟''

ویسے ان کے ''چھپ چھپا'' کر کرنے والے معاملے سے میں بھی متفق تھا' کیونکہ اگر یہ قصہ طشت از بام ہوتا تو تھوڑی بہت سن گن مشتاق پٹواری کو بھی ہو ہی جاتی۔ میرے سوال کے جواب میں رضیہ نے بتایا۔

''تھوڑی مشکل تو پیش آئی ہے تھانیدار جی لیکن میں نے جیسے تیسے آپ کے حکم کے مطابق کام کر دیا ہے......''

''اس چکر کا اور کس کو پتا ہے رضیہ؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی جی۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''اگر تمہیں اس چکر کو ثابت کرنے کو کہوں تو پھر تم کیا کرو گی؟''

''میں گواہی کیلئے شاہدہ کو آپ کے پاس پیش کر دوں گی۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''یہ شاہدہ کون ہے؟'' میں نے قدرے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''یہ سگی کی بہت قریبی دوست ہے۔'' رضیہ نے بتایا۔ ''میں نے بڑی مشکل سے اس

سے اس چکر کے بارے میں اگلوایا ہے۔ اگر سگی زندہ ہوتی تو شاید شاہدہ زبان نہ کھولتی۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں اس چکر کے بارے میں اور کسی کو نہیں بتاؤں گی۔''

''رضیہ! یہ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔ تم گھر جا کر آرام کرو......''

صابر علی نے پوچھا۔ ''رضیہ کو دوبارہ تھانے آنے کی ضرورت تو نہیں؟''

''بالکل نہیں......!'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''میں شاہدہ اور بشارت جٹ سے خود ہی نمٹ لوں گا۔''

''کہیں میرا نام تو نہیں آئے گا جناب......؟'' رضیہ نے حفظ ماتقدم کے طور پر پوچھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''تم بے فکر ہو جاؤ۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہوگا وہ اپنے مخصوص انداز میں کروں گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں نے تمہاری فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں آگے بڑھ کر بشارت جٹ کی گردن پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

''گردن پر ہاتھ ڈالا ہے۔'' کے الفاظ نے ان میاں بیوی کو بری طرح چونکا دیا۔ صابر علی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''خیریت تو ہے نا ملک صاحب......؟''

''خیریت ہوتی تو سگی اپنی جان سے کیوں جاتی۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سگی کی موت میں بشارت جٹ کا ہاتھ ہے؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔'' میں نے ایک بار پھر مبہم انداز میں کہا۔

ان کے چہروں پر موجود الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ وہ کبھی مجھے اور کبھی ایک دوسرے کو تعجب خیز انداز میں تکنے لگے۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

''تم لوگ اپنے ذہنوں کو نہ تھکاؤ اور گھر جا کر آرام کرو۔ میری تفتیش کا جو بھی نتیجہ برآمد ہوگا وہ آپ لوگوں کے سامنے آجائے گا۔''

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہوگئے۔



شاہدہ اور بشارت کو میں نے یکے بعد دیگرے تھانے بلوالیا تھا۔

ان کی آمد میں میں نے دانستہ آدھے گھنٹے کا فرق رکھا تھا اور یہ کارروائی صابر علی و رضیہ

کے جانے کے فوراً بعد عمل میں آگئی تھی۔ میں متعلقہ لوگوں کو ایک رات کی مہلت دینے کو تیار نہیں تھا۔ بشارت جٹ کو گاؤں سے باہر کھیتوں میں سے پکڑا گیا تھا' اس لئے وہ اکیلا ہی تھا جبکہ شاہدہ کو اس کے گھر سے نکال کر تھانے لایا گیا تھا' چنانچہ اس کی ماں رحمت بی بی بھی ساتھ آگئی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ بشارت جٹ کو اس بات کی قطعاً کوئی خبر نہیں تھی کہ گھر کی بھیدن شاہدہ بھی اس وقت تھانے میں موجود ہے۔ بشارت حوالات میں تھا اور شاہدہ اپنی ماں کے ساتھ اس وقت میرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ میں نے رحمت بی بی کو بتا دیا تھا کہ معمول کی پوچھ گچھ کے بعد میں انہیں گھر جانے کی اجازت دے دوں گا۔ میں دراصل شاہدہ سے رضیہ کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا تاکہ بشارت جٹ پر بڑی مضبوطی کے ساتھ ہاتھ ڈالا جا سکے۔ میں نے واقعتاً شاہدہ اور اس کی ماں کو دس پندرہ منٹ میں فارغ کر دیا۔ میں نے بڑے طریقے سلیقے سے شاہدہ کی زبان سے وہ راز اگلوالیا جو تھوڑی دیر پہلے رضیہ کی زبانی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے جب انہیں زبان بند رکھنے کی تاکید کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تو انہیں یقین نہیں آیا۔ رحمت بی بی نے غیر اعتباری انداز میں مجھے دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہم جائیں جی......؟''

''ہاں' ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''تو کیا آج رات تھانے میں گزارنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں جی...... بالکل نہیں!'' رحمت بی بی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''خدا کسی دشمن کو بھی تھانے میں رات گزارنے کا موقع نہ دے۔''

''تمہارا مطلب ہے' ہم کسی دشمن سے بھی زیادہ برے لوگ ہیں۔'' میں نے تفریحاً پوچھ لیا۔ ''جو دن رات یہاں تھانے میں پڑے رہتے ہیں۔''

''نہیں جی' یہ بات نہیں۔'' وہ تصحیح کرنے والے انداز میں بولی۔ ''آپ تو اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہیں۔''

''تم دونوں بھی اپنی ڈیوٹی نبھانے کی کوشش کرنا۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''یاد ہے نا' میں نے تمہیں کیا ہدایات دی ہیں؟''

"جی یاد ہے' یاد ہے......" انہوں نے بیک زبان کہا' پھر بڑی سرعت کے ساتھ وہ میرے کمرے سے رخصت ہوگئیں۔

ان کی اضطراری عجلت کو دیکھتے ہوئے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ان کے ذہنوں میں یہ خوف جاگزیں ہے کہ اگر وہ مزید ایک لحہ بھی تھانے میں رک گئیں تو میں انہیں پکڑ کر حوالات میں بند کردوں گا۔

ان کے جانے کے پانچ منٹ بعد میں نے بشارت جٹ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہ میرے عملے کے کئی افراد سے یہ سوال کر چکا تھا کہ اسے کس جرم میں پکڑ کر تھانے لایا گیا ہے۔

وہ میرے سامنے پہنچایا گیا تو میں نے کڑی نظر سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"جانتے ہو بشارت...... میں نے تمہیں کیوں یہاں بلوایا ہے؟"

"تھانیدار صاحب! یہ بات تو میں نے کئی لوگوں سے پوچھی ہے۔" وہ فریادی لہجے میں بولا۔ "لیکن کوئی مجھے کچھ بتاتا ہی نہیں ہے......"

"اس لئے کوئی کچھ نہیں بتاتا کہ یہ تمہارا نہیں' میرے پوچھنے کا سوال ہے۔" میں نے سخت انداز میں کہا۔ "بتاؤ' تم میں ایسی کون سی خوبی چھپی ہے جسے دیکھنے کیلئے میں نے تمہیں بڑے چاؤ سے اپنے پاس بلایا ہے......؟"

"جی...... آپ کی باتیں تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہیں۔" وہ چوکنا نظر سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں بہت پریشان ہوگیا ہوں جی۔"

"میں سمجھتا ہوں تمہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "دیکھنا چٹکی بجانے میں تمہاری ساری پریشانی دور ہوجائے گی۔"

وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔

آئندہ پانچ منٹ میں' میں نے اسے اس کے کرتوتوں سے آگاہ کردیا۔ وہ کسی بھی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے میرے بعض سوالوں کے جوابات ایسے بودے دیئے تھے کہ اس کے سگی کی موت میں ملوث ہونے کا مجھے یقین ہوگیا۔ لہٰذا میں نے اس کی تن فن اور اکڑفوں کو زائل کرنے کیلئے اسے حوالدار برکت علی کے حوالے کردیا۔

حوالدار برکت مجرموں کی زبان کھلوانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔



اگلی صبح میں تھانے پہنچا تو برکت علی نے بشارت جٹ کو بالکل سیدھا کردیا تھا۔ رات بھر کی مہمان داری نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے۔ مجھے پتا چلا کہ رات کو شوکت جٹ نے دوتین مرتبہ تھانے کا چکر لگایا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن تھانے کے عملے نے اسے حوالات تک جانے کا موقع فراہم نہیں کیا تھا اور یہ سب میری ہدایت کا نتیجہ تھا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا تو حوالدار برکت علی نے بشارت جٹ کو میرے سامنے پیش کردیا اور بڑے فخر سے بتایا۔

"ملک صاحب! بندہ سچ بولنے پر پوری طرح آمادہ ہے جی۔ آپ چاہیں تو اس کا بیان قلمبند کرلیں۔"

"ہوں......" میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا' پھر بشارت جٹ کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔ "کیوں بھئی سورما...... برکت علی ٹھیک کہہ رہا ہے......؟"

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ رحم طلب نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ رات حوالدار نے اس کی کچھ زیادہ ہی مہمان داری کردی تھی۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آتا تھا۔ میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور بشارت جٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی......شروع ہوجاؤ"

اور وہ میرا اشارہ پاتے ہی شروع ہوگیا۔

اس روز میں نے بشارت جٹ کا جو بیان قلمبند کیا وہ درحقیقت اس کا اقبال جرم تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بڑے تمام جرائم کا اقرار کرلیا تھا۔ واقعات کے مطابق اس نے ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت سگی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھا۔ انہی چوری چھپے کی ملاقاتوں میں ایک نازک لمحے کے دوران میں' وہ دونوں تمام اخلاقی حدود کو پھلانگتے چلے گئے جس کا نتیجہ وہی نکلا جو پوسٹمارٹم کی رپورٹ میں درج تھا۔

اپنے اقبالی بیان میں بشارت جٹ نے جو سب سے زیادہ سنسنی خیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ یہ سب کچھ اس نے سگی کی چاچی زلیخا کے اشارے پر کیا تھا۔ زلیخا سگی سے بہت زیادہ

حسد کرتی تھی۔ نغمہ کیلئے جو بھی رشتہ آتا وہ لوگ سگی کو پسند کر کے چلے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ زلیخا کی سگی کیلئے نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے ایک تیر سے کئی شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بشارت جٹ کے ساتھ سگی کو ملوث کر کے مشتاق پٹواری کی نظر میں اسے گرانا چاہتی تھی کہ وہ ایک آوارہ اور بدمعاش لڑکی ہے اور اس کی صحبت کا اثر نغمہ پر بھی پڑ سکتا ہے۔

مشتاق پٹواری اپنی بھابی اور بھتیجی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب خورشید بی بی کہیں گم ہو گئی تو پٹواری کی ساری توجہ سگی کی جانب مبذول ہو گئی تھی اور اس بات سے زلیخا کو بڑی اذیت پہنچتی تھی' وہ حسد اور حرص کی آگ میں جلنے لگی تھی۔

زلیخا کی خواہش تھی کہ سگی کسی طرح مشتاق پٹواری کی نظر میں بری ثابت ہو جائے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اس نے بشارت جٹ کی مدد سے ایک ڈرامہ رچایا' لیکن جب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ بشارت جٹ نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے تو اسکے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

دوسری جانب بشارت بھی بڑی مشکل میں آ گیا تھا۔ ان کے مشترکہ کارنامے کے نتائج کی روشنی میں سگی نے بشارت جٹ سے شادی کیلئے ضد شروع کر دی۔ یہ زلیخا کے پروگرام کا حصہ نہیں تھا۔ جب زلیخا اور بشارت جٹ نے ایک دوسرے کو اپنی بپتا سنائی تو زلیخا کے شیطانی ذہن نے فوراً اس مسئلے کا حل نکال لیا۔

اس نے بشارت جٹ کے ذریعے سگی تک سفوف کی ایک پڑیا پہنچوائی جو درحقیقت ایک زود اثر زہر تھا۔ بشارت نے مذکورہ پڑیا سگی کو دیتے ہوئے کہا کہ اگر وہ رات کو سوتے وقت یہ دوا کھا لے گی تو اسے اس مصیبت سے نجات مل جائے گی جس کی وجہ سے وہ بشارت جٹ کو شادی کیلئے مجبور کر رہی ہے۔

سگی کے پاس اور کوئی محفوظ راستہ نہیں تھا لہٰذا مجبوراً اسے بشارت جٹ کی بات ماننا پڑی جو کہ اصل میں زلیخا کی بات تھی۔ بہرحال' حسب پروگرام وقوعہ کی رات سگی نے سفوف کی وہ پڑیا اپنے معدے میں پہنچا دی اور موت کی ابدی نیند سو گئی۔

زلیخا نے اپنے منصوبے کو فائنل ٹچ دینے کیلئے بشارت جٹ کی مدد سے سگی کی لاش کو پھانسی پر لٹکا دیا تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ سگی نے خودکشی کی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ نکتہ موجود تھا کہ اگر پولیس کو کسی طرح سگی کے پیٹ میں پوشیدہ راز کی خبر ہو بھی گئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ

سگی نے اپنے گناہ کو چھپانے کیلئے خودکشی کی ہے چنانچہ زلیخا کی راہ کا ہر کانٹا صاف ہو جاتا۔

زلیخا کی یہ بدقسمتی کہ میں سگی کی لاش کو دیکھتے ہی چونک گیا تھا اور ایک مخصوص سوچ کے ساتھ جب میں نے اپنی تفتیش کو آگے بڑھایا تو کامیابی نے میرے قدم چوم لئے تھے۔

میں نے بشارت جٹ اور زلیخا بی بی کے خلاف بڑا سخت قسم کا چالان تیار کر کے انہیں عدالت کے حوالے کر دیا۔ ان کے ذہنوں اور دلوں میں موجود ہوس نے جو فتنہ جگایا تھا اس نے مشتاق پٹواری کے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔

برائی کا انجام بالآخر ہلاکت اور تباہ کاری ہی ہے۔

◊◊◊◊

فسادِ جہل

گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے بچے کا ماموں اعجاز میرے پاس پہنچا تھا۔ میں نے اسے بٹھایا اور پوچھا۔ ''بچے کا نام کیا ہے اور وہ کب سے گم ہے......؟''

''اس کا نام تو جاوید ہے جناب۔'' اعجاز نے جواباً بتایا۔ ''لیکن اسے ''جیدا'' کہتے ہیں۔ جیدا آج دوپہر ہی سے غائب ہے۔''

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ وہ ماہ اگست کی اختتامی تاریخیں تھیں۔ بھادوں جوبن پر تھا۔ ساون نے جو کسر چھوڑی تھی اسے بھادوں بڑی ذمہ داری کے ساتھ پورا کر رہا تھا۔ میں نے اعجاز حسین کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جیدا دوپہر سے غائب ہے اور تم اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے اب میرے پاس آئے ہو......!''

''ہم لوگ اب تک اپنے طور پر جیدا کو گاؤں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ایک ایک گھر میں جھانک لیا ہے۔ پورے ''شاہ پور'' میں اس کا نام ونشان نہیں ملا۔''

شاہ پور میرے تھانے سے نزدیک ترین ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ تھانے سے گاؤں کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ ہوگا۔ شاہ پور میں لگ بھگ سوا سو گھر ہوں گے۔ اس حساب سے یہاں کی آبادی کو چار سو پانچ سو نفوس تک شمار کیا جاسکتا ہے۔

''ہوسکتا ہے' جیدا گاؤں سے کہیں باہر چلا گیا ہو؟'' میں نے ایک واضح امکان کی جانب اشارہ کیا۔

اعجاز حسین نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا جناب۔ ابھی اس کی

عمر اتنی نہیں کہ وہ اکیلا گاؤں سے باہر چلا جائے۔''

''جیدا کی عمر کتنی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

اعجاز نے بتایا۔ ''لگ بھگ آٹھ سال۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''جیدا کے ماں باپ کہاں ہیں؟''

''ماں اور نانی تو گھر پر ہے تھانیدار صاحب!'' وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ ''اور حیدر کا باپ لاہور میں رہتا ہے۔''

شہر لاہور' موضع شاہ پور سے کم وبیش پینتیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں اعجاز سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیا جیدا کے باپ کو اس کی گمشدگی کا پتا ہے؟''

''ابھی تک تو پتا نہیں ہے جناب۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اور پتا چل بھی جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں......!''

''یہ کیا بات کی تم نے!'' میں نے حیرت بھری نظر سے اعجاز کی طرف دیکھا۔ ''سب سے پہلے تو جیدا کے باپ ہی کو اس واقعہ کی خبر ہونا چاہئے تھی۔ تم نے ایسے کیوں کہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے تھانیدار صاحب......!'' وہ بددلی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جیدا کے باپ علی نواز نے چار سال پہلے میری بہن کو طلاق دے دی تھی۔ جب سے خالدہ امی کے پاس ہی رہ رہی ہے...... علی نواز نے ادھر لاہور میں دوسری شادی کر رکھی ہے...... اس کے ساتھ ہمارا جینا مرنا چار سال پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔''

''اوہ...... تو یہ بات ہے!'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ ''تم نے دوسرے بچوں سے جیدا کے بارے میں پوچھ تاچھ کی ہے؟''

چھپڑ بہ معنی جوہڑ...... پنجاب کے گاؤں دیہات میں جوہڑ کو چھپڑ کہا جاتا ہے۔ چھپڑ بہت کام کی چیز ہوتا ہے۔ کچے مکانوں کی لیپا پوتی کیلئے اسی چھپڑ سے مٹی نکالی جاتی ہے۔ گاؤں کی بھینسیں اور دیگر ڈھور ڈنگر اسی چھپڑ سے نہ صرف اپنی پیاس بجھاتے ہیں بلکہ ان کا نہانا دھونا بھی چھپڑ ہی میں ہوتا ہے۔ بعض بچے اور بڑے بھی چھپڑ میں ڈبکیاں لگاتے نظر آتے ہیں۔ جب اعجاز نے چھپڑ کا ذکر کیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔

''کہیں جیدا چھپڑ میں دوسرے بچوں کے ساتھ نہا تو نہیں رہا تھا؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

''تھانیدار جی! یہ تو بچوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔'' وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ''آج کل تو ویسے بھی گرمی کا موسم ہے اور حالیہ بارشوں نے چھپڑ کو کناروں تک بھر رکھا ہے......''

میرے ذہن میں اس خدشے نے سر ابھارا کہ کہیں جاوید عرف جیدا چھپڑ میں نہاتے ہوئے ڈوب نہ گیا ہو۔ ٹھیک ہے' کناروں پر چھپڑ کی گہرائی زیادہ نہیں ہوتی لیکن جیسے جیسے آگے بڑھیں اس کی گہرائی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور عین وسط میں نوجوان بندے کے سینے تک پانی کھڑا ہوتا ہے۔ جیدا کے ڈوبنے کے خدشے کے پیش نظر میں نے اعجاز سے سوال کیا۔

''جیدا آج دوپہر میں جن بچوں کے ساتھ چھپڑ کے قریب کھیل رہا تھا' ان کے نام کیا ہیں اور انہوں نے اس کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''بچوں کے نام تو ہیں جی...... بوٹا' کرمو اور بھولا۔'' اعجاز نے بتایا۔ ''میں نے بہت کرید کرید کر ان سے پوچھا ہے' سب نے ایک جیسا بیان دیا ہے جناب...... وہ کہتے ہیں' انہیں جیدا کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ وہ سب مل کر ایک ساتھ کھیل رہے تھے' پھر جیدا اپنے گھر چلا گیا تھا...... اس کے بعد انہیں کچھ پتا نہیں۔''

''جیدا...... بچوں کے مطابق' اپنے گھر چلا گیا تھا مگر وہ اپنے گھر پہنچا نہیں۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا' پھر اعجاز سے پوچھا۔ ''جیدا نے لباس اور جوتے کس طرح کے پہن رکھے تھے......؟''

''اس بارے میں تو مجھے کچھ پتا نہیں جناب۔'' وہ معذرت خواہانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے اس سوال کا جواب تو جیدا کی ماں خالدہ ہی دے سکتی ہے یا پھر وہ بچے جن کے ساتھ وہ کھیل رہا تھا۔ میرے ذہن میں بالکل نہیں آیا کہ ان سے پوچھوں......!''

''کوئی بات نہیں اعجاز! تمہارے ذہن میں نہیں آیا تو میں پوچھ لوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جیدا کی ماں سے بھی اور اس کے دوستوں سے بھی۔''

''جیدا مل جائے گا نا تھانیدار صاحب؟'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''فکر نہ کرو اعجاز اور اللہ سے امید رکھو۔ میں جلد از جلد

جیدا کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے!'' وہ دعائیہ انداز میں بولا۔ ''مجھ سے خالدہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ جیدا اس کیلئے خوشیوں کا واحد سہارا تھا۔''

''میں تمہاری بہن کے درد کو سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم حوصلہ رکھو اور خالدہ کو بھی حوصلہ دو۔ سمجھو کہ میں نے ابھی سے جیدا کی تلاش کا کام شروع کر دیا ہے اور اندھیرا ہونے سے پہلے میں خالدہ سے ملنے اس کے گھر بھی آ رہا ہوں۔ تم کوشش کرنا کہ جیدا کے وہ تینوں دوست مل جائیں' گمشدگی سے پہلے وہ جن کے ساتھ چھپڑ کے کنارے کھیل رہا تھا۔ میں ان سے پوچھ گچھ کروں گا۔''

''آپ فکر نہ کریں جناب۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''میں ان بچوں کو جمع کر کے رکھوں گا۔ وہ جائیں گے کہاں۔ آس پاس ہی کے بچے تو ہیں......''

میں نے تسلی دلاسا دے کر اعجاز کو رخصت کر دیا۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا' موضع شاہ پور میرے تھانے سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر واقع تھا۔ شہروں میں رہنے والے اور ''فرلانگ'' سے ناآشنا افراد اس فاصلے کو دو سو بیس گز سمجھ لیں۔ تھانے سے بڑے آرام سے ٹہلتے ہوئے شاہ پور جایا جا سکتا تھا۔ شاہ پور کا رہنے والا ایک کانسٹیبل بھی میرے تھانے میں ہوتا تھا۔ اس کا نام افضل تھا اور ظاہر ہے' وہ جیدا کی گمشدگی والے واقعہ سے واقف نہیں ہوگا۔ وہ بے چارہ صبح ہی سے ڈیوٹی پر تھا۔

میں نے افضل کو اپنے ساتھ شاہ پور لے جانے کا فیصلہ کیا اور ضروری تیاری کیلئے اسے اپنے پاس بلا لیا۔



میں نے جیدا کے ڈوبنے والے امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے تفتیش کا آغاز کیا اور بوٹا' کرمو' بھولا وغیرہ کو ساتھ لے کر گاؤں کے جوہڑ پر پہنچ گیا۔ اندھیرا ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی۔ میں دن کی روشنی ہی میں یہ کام نمٹا دینا چاہتا تھا۔

بوٹا' کرمو اور بھولا کی عمریں سات اور دس سال کے درمیان تھیں اور ان میں بھولا نسبتاً زیادہ سمجھ دار تھا۔ وہ پورے دس سال کا تھا۔ جیدا کے گھر سے جوہڑ کی جانب آتے ہوئے میں نے ان تینوں کا مفصل انٹرویو بھی کر ڈالا تھا لیکن کوئی ایسی بات سامنے نہ آئی جو جیدا کی تلاش

میں میری مددگار ثابت ہوسکتی۔ ان سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ اعجاز مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

میں اور کانسٹیبل پولیس یونیفارم میں تھے۔ لہٰذا ہمیں دیکھ کر نصف درجن سے زیادہ لوگ وہاں جمع ہوگئے۔ چند افراد اس وقت بھی بھینسوں کے ساتھ جوہڑ کے اندر موجود تھے۔ میں نے بھولا سے پوچھا۔

"بھولا! اس وقت تم لوگ کس جگہ کھیل رہے تھے؟"

بھولا نے ایک جگہ کی نشاندہی کردی۔

میں نے جوہڑ کے اندر موجود لوگوں سے کہا کہ وہ اس کنارے پر پانی میں ہاتھ پاؤں چلا کر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ جیدا کہیں پانی کے اندر ڈوبا ہوا تو نہیں۔ جب گاؤں کے ایک نوعمر بچے کے ڈوبنے کے بارے میں ان لوگوں کو پتا چلا تو انہوں نے ماہر تیراکوں کے مانند جیدا کی تلاش کا کام شروع کردیا۔

بوٹا' کرمو اور بھولا کے بیان سے تو یہی بات سامنے آئی تھی کہ جیدا ان سے جدا ہوکر سیدھا اپنے گھر کی طرف گیا تھا لیکن میں نے پھر بھی اپنا شک دور کرنے کیلئے جوہڑ میں جیدا کی تلاش کا کام ضروری سمجھا تھا۔

بیس پچیس منٹ کی کڑی تلاش کے بعد میرا شک دور ہوگیا۔ یعنی جیدا کا جوہڑ کے اندر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ وہاں پر موجود لوگوں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص آگے بڑھا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"تھانیدار صاحب! اگر بچہ اس چھپڑ میں ڈوبا ہوتا تو اب تک اس کی لاش اوپر آچکی ہوتی' دوپہر سے اب تک کافی وقت گزر چکا ہے....."

میں نے بغور اس شخص کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ "چاچا..... تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ہے جی..... برکت۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"چاچا برکت! تم جس نکتے کی طرف اشارہ کر رہے ہو نا' وہ میرے ذہن میں بھی ہے لیکن پھر بھی تفتیش کے دوران ہر پہلو کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے..... اب یہ تسلی تو ہوگئی نا کہ جیدا اس چھپڑ میں کہیں غائب نہیں ہوا۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے

ہوئے بولا۔

میں نے وہاں موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور باآواز بلند کہا۔ "تم سب اس حقیقت سے اب تک واقف ہوچکے ہو کہ اعجاز کا بھانجا جاوید عرف جیدا آج دوپہر سے غائب ہے۔ اعجاز نے جیدا کی تلاش میں پورا گاؤں چھان مارا ہے۔ آپ لوگ بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ جیسے ہی جیدا نظر آئے یا اس کے بارے میں کوئی اہم بات معلوم ہو' آپ سیدھے تھانے آکر مجھے بتائیں گے....."

انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ جیدا ان کے اپنے بچوں جیسا بچہ ہے۔ وہ بھی اس کی گمشدگی پر بہت پریشان ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جیدا کو اپنے تئیں تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔

میں مطمئن ہوکر جیدا کے گھر آگیا۔

اس گھر میں جیدا کی ماں خالدہ اور اس کی نانی گلزار بی بی کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ اعجاز کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس کی رہائش یہاں سے ایک گلی چھوڑ کر تھی' جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ میں خالدہ کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

خالدہ کی عمر تیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ ایک قبول صورت اور فربہ اندام عورت تھی' تاہم اس وقت اکلوتے بیٹے کی جدائی نے اسے ملول کر رکھا تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"خالدہ بی بی! میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں اور میرا یہ وعدہ ہے کہ جیدا کو جلد از جلد ڈھونڈ نکالوں گا' لیکن اس کام کیلئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے.....!"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "جی..... میں آپ کی بھلا کیا مدد کرسکتی ہوں.....؟"

"مجھے جیدا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کی ضرورت ہے۔"

"کس قسم کی معلومات؟" اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

میں نے کہا۔ "آپ کو کب پتا چلا کہ جیدا غائب ہے؟"

"دن میں جب وہ کھانا کھانے کیلئے گھر نہیں آیا تو مجھے فکر ہوئی۔" اس نے بتایا "میں بھائی اعجاز کے گھر گئی۔ وہ کبھی کبھی اس کے بچوں کے ساتھ کھیلنے بھی چلا جاتا تھا لیکن ادھر جا کر

پتا چلا کہ جیدا وہاں گیا ہی نہیں۔ بھائی اعجاز کو فکر ہوئی۔ اس نے دکانداری چھوڑی اور جیدا کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے سارا پنڈ چھان مارا مگر جیدا کہیں نہیں ملا۔ تھک ہار کر اعجاز رپورٹ لکھوانے آپ کے پاس چلا گیا......" وہ لمحے بھر کیلئے متوقف ہوئی' ایک گہری سانس خارج کی' پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"ہوں......!" میں نے متاسفانہ انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ "وہ آج کتنے بجے گھر سے نکلا تھا؟"

"میرا خیال ہے' دس بجے۔" خالدہ نے جواب دیا۔ "پھر وہ واپس نہیں آیا۔"

"کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی' یہ پہلا واقعہ ہے۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "کھیلنے کیلئے تو وہ روز ہی گھر سے باہر جاتا تھا لیکن دن میں کھانے کے وقت وہ واپس آجاتا تھا' مگر......" بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی اور وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

میں نے لمحاتی توقف کے بعد اس سے پوچھا۔ "آج جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس سے پہلے کوئی خاص واقعہ تو پیش نہیں آیا تھا؟"

"مثلاً؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ "کس قسم کا واقعہ تھانیدار صاحب......!"

"مثلاً یہ کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں میں سے کسی نے اسے ڈانٹا ہو' جھڑکا ہو یا بہت زیادہ غصہ کیا ہو اس پر؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی' پھر مجھ سے پوچھا۔ "کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے......؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "پولیس آفیسر ہونے کے ناتے مجھے ہر انداز میں سوچنا پڑتا ہے۔ میں اس امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتا کہ وہ کسی بات پر خفا ہو کر ادھر ادھر نکل گیا ہو' ویسے......" میں نے تھوڑی دیر رک کر سوچتی ہوئی نظر سے خالدہ کو دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس بات کا ثبوت تو مل گیا ہے کہ وہ دوپہر تک چھپڑ کے کنارے اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بوٹا' کرمو اور بھولا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ انہیں یہ بتا کر آیا تھا کہ گھر جا رہا ہے......ساری گڑبڑ چھپڑ سے لے کر تمہارے گھر تک کے راستے میں ہوئی ہے۔"

"جو بھی ہوا ہے یہ تو مجھے نہیں پتا......" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ "مجھے جیدا چاہئے۔ آپ جلد از جلد اسے تلاش کریں۔ وہ سب کی آنکھ کا تارا تھا۔ پتا نہیں...... میرے جیدا کو کس کی نظر کھا گئی ہے......!"

خالدہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کے بھائی اعجاز کو بھی قریب بلالیا۔ اعجاز کی کریانے کی دکان تھی جو اس نے جیدا کی گمشدگی کی وجہ سے آج دوپہر ہی کو بند کردی تھی۔ میں نے اعجاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی؟"

"بالکل نہیں جناب!" وہ جلدی سے بولا۔ "ہم صلح صفائی سے رہنے والے امن پسند لوگ ہیں۔ دشمنیاں پالنا ہمارے بس کا کام نہیں۔"

میں نے ایک فوری خیال کی تسکین کیلئے پوچھ لیا۔ "کیا خالدہ کے سابق شوہر یعنی جیدا کے باپ علی نواز کا تعلق بھی شاہ پور ہی سے ہے؟"

"جی ہاں' وہ یہیں کا رہنے والا تھا۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "لیکن اب کافی عرصے سے وہ مستقل لاہور ہی میں رہ رہا ہے۔ بس کبھی کبھار ہی ادھر کا چکر لگا لیتا ہے......!"

"بھائی اعجاز!" خالدہ نے شاکی نظر سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ "آپ تھانیدار جی کو آدھی بات بتا رہے ہیں......"

"اچھا......" میں نے چونک کر خالدہ کی جانب دیکھا۔ "تو اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہے......؟"

اعجاز جز بز ہو کر رہ گیا۔ میں نے خالدہ سے کہا۔ "میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ باقی کی آدھی بات تم بتادو۔"

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "دراصل' علی نواز کے ماں باپ بچپن ہی میں خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ اسے اس کے چاچا اور چاچی نے پالا ہے جو ادھر شاہ پور ہی میں رہتے ہیں۔ علی نواز کو کھیتی باڑی اور زراعت کے کاموں سے چڑ تھی لہٰذا وہ نوکری کی تلاش میں لاہور چلا گیا۔ جب میری شادی ہوئی' اس وقت بھی وہ لاہور میں ملازمت کرتا تھا۔ مہینے میں ایک دو دن کیلئے یہاں آتا تھا اور پھر واپس چلا جاتا تھا' پھر ہمارے بیچ جھگڑے شروع ہو گئے اور......" وہ یک دم بے حد اداس ہو گئی۔

"اور پھر......؟" میں نے کریدا۔

"پھر ہمارے راستے الگ ہو گئے۔" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ "چار سال پہلے علی نواز نے مجھے طلاق دے دی۔ اس وقت جیدا چار سال کا تھا......"

"اس افسوسناک واقعہ کے بعد ہی اس نے دوسری شادی کی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" خالدہ نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ "دوسری شادی اس نے ایک سال پہلے کی ہے اور ہمارے درمیان جھگڑے کی بنیادی وجہ بھی علی نواز کی دوسری شادی ہی تھی۔ یہ تنازع ایک سال تک چلتا رہا' پھر علی نواز نے نورین کے حق میں فیصلہ کیا اور مجھے طلاق دے دی......"

"نورین' علی نواز کی دوسری بیوی کا نام ہے؟" میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

خالدہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ "طلاق کے وقت علی نواز نے اپنے بیٹے کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟"

"بالکل نہیں تھانیدار صاحب!" اعجاز نے جواب دیا۔ "اس نے جھوٹے منہ سے بھی ایک بار جیدا کو لینے کا مطالبہ نہیں کیا......!"

"یعنی اس کے دل میں جیدا کیلئے کوئی طلب' کوئی تڑپ نہیں تھی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"آپ سیانے بیانے ہیں تھانیدار صاحب! اعجاز نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جس شخص کو اپنی اولاد سے محبت ہو' وہ اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیتا اور نہ ہی وہ دوسری شادی کے بارے میں سوچتا ہے۔"

میں نے اعجاز سے پوچھا۔ "تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ علی نواز کبھی کبھار ادھر چکر لگا لیتا ہے تو کیا جب وہ یہاں آیا ہوتا ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو دیکھنے یا اس سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔"

"یہی تو میں آپ کو بتانا چاہ رہی تھی تھانیدار صاحب!" خالدہ جلدی سے بولی۔ "بھائی اعجاز نے کسی مصلحت کی وجہ سے آپ کو پوری بات نہیں بتائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مجھے طلاق ہوئی اس کے بعد سے تو علی نواز نے شاہ پور میں قدم ہی نہیں رکھا' جیدا کو دیکھنے یا اس

سے ملنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔"

"تم نے کس مصلحت کی بنا پر مجھ سے غلط بیانی کی ہے؟" میں نے اعجاز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی مصلحت نہیں جناب!" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "بس' وہ کیا کہتے ہیں کہ...... قمیض اٹھاؤ تو اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے......"

میں نے باری باری خالدہ اور اعجاز کی جانب دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"کیا جیدا کی گمشدگی میں علی نواز کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"بظاہر ایسا لگتا تو نہیں تھانیدار صاحب!" اعجاز نے جواب دیا۔

"بظاہر جو شے نظر نہ آ رہی ہو اس کے بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے علی نواز کا اتا پتا بتائیں۔ میں اسے بھی چیک کروں گا۔"

"اس کا پتا تو ہمارے پاس نہیں ہے۔" خالدہ نے جواب دیا۔ "اس کے چاچا' چاچی سے مل سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں علی نواز کے چاچا چاچی سے بھی مل لوں گا۔" میں نے کہا۔ "آپ لوگ جیدا کی گمشدگی کے حوالے سے اور کچھ جانتے ہیں تو مجھے بتائیں......؟"

جب خالدہ اور اعجاز اس سلسلے میں مجھے مزید معلومات فراہم نہ کر سکے تو میں انہیں تسلی دلاسا دے کر واپس آ گیا۔



اگلے روز میں نے دو اہم کام کئے۔

نمبر ایک' میں نے ایک بندہ بھیج کر علی نواز کے چاچا نذیر حسین کو تھانے بلا لیا۔ نمبر دو' میں نے دو سادہ لباس پولیس اہلکاروں کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ شاہ پور میں گھوم پھر کر جیدا کے بارے میں معلومات اکٹھی کریں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کانسٹیبل افضل کو بھیج کر کھوجی شرافت علی کو بلا لیا۔ ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا کہ میں نے رات خالدہ سے بات کرتے ہوئے جیدا کی تصویر کے بارے میں سوال کیا تھا تاکہ اس بچے کی تلاش کے کام کو آسان بنایا جا سکے' لیکن خالدہ اور اعجاز نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس جیدا کی کوئی تصویر موجود نہیں۔ اب مجھے دوسرے ذرائع ہی سے اس کا کھوج لگانا تھا......!

میں تھانے میں بیٹھا جیدا کی گمشدگی کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ بھادوں کی بارش انتہائی ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ ایک لمحے میں سورج چمک رہا ہوتا ہے اور دوسرے لمحے بارش شروع ہوجاتی ہے اور بعض اوقات تو دھوپ اور بارش ایک ساتھ اپنی اپنی جھلک دکھا رہی ہوتی ہیں۔ بھادوں کی بارش کی ایک خاصیت یہ ہے کہ بارش کے فوراً بعد دھوپ نکل آتی ہے اور دھوپ بھی ایسی کہ بدن میں سوئیاں چبھونے والی۔ اس موسم میں ویسے بھی جسم گرمی دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ایسے میں دھوپ کی چمک اور بارش کے کھڑے پانی کی تپش مل کر قیامت ڈھاتی ہیں۔

اس اچانک شروع ہونے والی بارش نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور اس تشویش کا سبب تھا جیدا کا کھرا......!

میں نے سوچا تھا کہ کھوجی شرافت علی سے جیدا کا کھرا نکلواؤں گا تاکہ پتا تو چلے کہ وہ چھپڑ سے اپنے گھر جاتے ہوئے راستے میں کہاں غائب ہوگیا تھا لیکن اس بارش نے جیدا کیا'

باقی لوگوں کے پاؤں کے نشانات کو بھی ملیامیٹ کر دیا تھا۔ اب کھرے کی مدد سے جیدا کا سراغ لگانا ممکن نہیں رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد نذیر حسین میرے پاس پہنچ گیا۔ نذیر حسین کی عمر پینتالیس سے متجاوز دکھائی دیتی تھی۔ وہ وضع قطع سے ایک عام دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے۔ گویا' وہ ایک چھوٹا زمیندار تھا۔

''نذیر حسین!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''جانتے ہو' میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟''

''کچھ کچھ اندازہ تو ہے تھانیدار جی۔'' اس نے جواب دیا۔

''مثلاً......کیا کچھ کچھ؟''

''خالدہ کا بچہ کل سے غائب ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے' آپ نے جیدا کے بارے میں کچھ پوچھنے کیلئے مجھے بلایا ہے۔''

''تمہارا خیال بالکل درست ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جیدا ہی کے سلسلے میں تمہیں بلایا ہے لیکن تم نے جیدا کیلئے ''خالدہ کا بچہ'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ کیا وہ علی نواز کا بھی بچہ نہیں ہے......؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''لیکن چار سال پہلے علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی تھی۔ اس کے بعد دونوں خاندانوں کا میل ملاپ نہیں رہا اس لئے میرے منہ سے نکل گیا......خالدہ کا بچہ!''

''کون سے دونوں خاندان؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''مم......میرا مطلب ہے' خالدہ اور علی نواز کا خاندان......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے' خالدہ کو طلاق دینے کے بعد علی نواز مستقل لاہور ہی کا ہو کر رہ گیا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''پچھلے چار سال سے اس بے وفا نے پلٹ کر آپ لوگوں کی بھی خبر نہیں لی......!''

وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......!''

''آپ لوگوں کے ساتھ علی نواز کی کیا ناراضی ہے؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں

پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے' وہ چھوٹا سا تھا جب اس کے والدین کا انتقال ہوگیا تھا۔ آپ دونوں میاں بیوی نے اسے پال پوس کر جوان کیا' اس کی شادی کرائی اور وہ...... آپ لوگوں ہی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ کیا ماجرا ہے نذیر حسین؟''

''ماجرا کیا تھانیدار صاحب......!'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''زمانے کا دستور یہی ہے۔ جس کے ساتھ نیکی کرو' وہی ڈنک مارتا ہے......!''

''میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں نذیر حسین؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

نذیر حسین اپنے بھتیجے علی نواز کی طرف سے خاصا خفا اور دلبرداشتہ نظر آرہا تھا۔ میں اسی لئے اسے ٹٹولنے کی کوشش کررہا تھا تاکہ جیدا کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی مفید نکتہ ہاتھ آسکے۔ چند لمحات تک چپ رہ کر وہ اپنی یادداشت میں ماضی کے واقعات کو مجتمع کرتا رہا' پھر ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔

''بڑے بھائی صاحب یعنی علی نواز کا باپ فرید احمد اور بھابی رفعت موضع جمال نگر میں رہتے تھے۔ ان کی پانچ اولادیں تھیں۔ ایک ایک کرکے چار بچے اور بھائی بھابی خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ علی نواز چھوٹا سا تھا کہ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کی پرورش کی۔ پال پوس کر جوان کیا۔ اپنے بیٹے طفیل سے زیادہ اس کا خیال رکھا۔ اسے زمین داری کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ روزگار کے سلسلے میں لاہور کا رخ کرنا بھی اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ دس سال پہلے میں نے اس کی شادی اعجاز کی بہن خالدہ سے کرادی۔ چھ سال تک یہ شادی روتے دھوتے چلتی رہی' پھر میاں بیوی کے درمیان ایسا تنازع اٹھا کہ جس کے نتیجے میں علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی......''

''یہ تنازع علی نواز کی دوسری شادی کی وجہ سے اٹھا تھا یا کوئی اور سبب بھی تھا؟'' وہ سانس لینے کیلئے تھما تو میں نے پوچھ لیا۔

''ایک سبب تو دوسری شادی بھی تھی جناب......!'' وہ گول مول انداز میں بولا۔

''اور دیگر اسباب کیا تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جناب تھانیدار صاحب! میں نے مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے اس لئے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''چاہے کوئی بات علی نواز کے حق میں جاتی ہو یا اس کی مخالفت میں......''

''سمجھ داری کا تقاضا یہی ہے نذیر حسین کہ کم از کم پولیس اور ڈاکٹر سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہئے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری گھر والی عنایت بی بی ہمیشہ مجھ سے کہتی تھی کہ میں علی نواز پر محنت کرکے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کررہا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''لیکن میں سگے بھائی کی اولاد سمجھ کر علی نواز کو اپنی اولاد کی طرح پالتا رہا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی لیکن وہی ہوا جو عنایت بی بی مجھ سے اکثر کہتی رہتی تھی۔ علی نواز نے ہم سے وفا نہیں کی بلکہ ہماری ناک کٹوادی۔ جب سے اس نے خالدہ کو طلاق دی ہے واپس پلٹ کر گاؤں کی طرف نہیں آیا۔ اپنی دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ لاہور ہی میں رہتا ہے۔ نورین سے اس کی دو اولادیں ہیں۔ یہ بھی مجھے اس وقت پتا چلا جب پچھلے سال میں کسی کام سے لاہور گیا تو علی نواز سے ملنے اس کے گھر بھی چلا گیا تھا۔ اس وقت مہوش دو سال کی اور فراز چھ ماہ کا تھا......''

''یہ سب تو ٹھیک ہے نذیر حسین!'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''تم مجھے خالدہ کی طلاق کے دوسرے اسباب کے بارے میں بتا رہے تھے؟''

''جی......!'' وہ لفظ کو اچھا خاصا کھینچنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ ''ہمارے لئے سب سے زیادہ شرمندگی کی بات یہ ہے کہ علی نواز' خالدہ کے کردار پر شک کرنے لگا تھا اور ڈھکے چھپے الفاظ میں کئی بار کہہ چکا تھا کہ جاوید عرف جیدا اس کا خون نہیں ہے۔ اصل فساد یہیں سے شروع ہوا تھا۔ جب بعد میں پتا چلا کہ اس نے لاہور میں دوسری شادی کررکھی ہے تو یہ فساد بڑھ کر خطرناک جنگ کی صورت اختیار کرگیا اور ایک سال کے اندر اندر خالدہ کو طلاق ہوگئی۔ پہلے وہ ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ طلاق کے بعد وہ اپنی ماں گلزار بی بی کے پاس چلی گئی۔ اعجاز ان لوگوں کی ہر قسم کی مدد کرتا رہتا ہے۔''

''کردار پر شک'' والی بات خالدہ یا اعجاز نے مجھے نہیں بتائی تھی۔ اب یہ نکتہ اچھی طرح میری سمجھ میں آگیا کہ علی نواز نے خالدہ کو طلاق دینے کے بعد اپنے بیٹے جیدا کے حصول کیلئے چارہ جوئی کیوں نہیں کی تھی۔ جب وہ جیدا کو اپنا خون ہی نہیں مانتا تھا تو پھر کسی قسم کی چارہ جوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!

میں مزید آدھے گھنٹے تک نذیر حسین سے گھما پھرا کر مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا

جس سے بس یہی پتا چل سکا کہ علی نواز کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بس' نذیر حسین نے ایک سال پہلے علی نواز کو لاہور میں اس کے گھر میں ہی دیکھا تھا۔ اس کے بعد کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

میں نے علی نواز کا لاہور کا ایڈریس اور اس کے کام کاج کے بارے میں نذیر حسین سے تفصیل حاصل کی اور اسے رخصت کر دیا۔ نذیر حسین جس حد تک میرے لئے کار آمد ہو سکتا تھا وہ میں نے جان لیا تھا۔

نذیر حسین کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد افضل میرے پاس آ گیا۔ افضل نامی اس کانسٹیبل کا تعلق موضع شاہ پور ہی سے تھا۔ میں نے افضل کو کھوجی بابا شرافت علی کو لانے کیلئے بھیجا تھا۔

''کیا رپورٹ ہے افضل؟'' وہ آ کر میرے سامنے بیٹھا تو میں نے پوچھ لیا۔

''رپورٹ تسلی بخش نہیں ہے ملک صاحب!'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ''کھوجی شرافت علی دو دن سے چکوال گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی میں ابھی دو تین دن مزید لگیں گے۔''

''تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ''اس کی اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔''

''ضرورت نہیں رہی......!'' کانسٹیبل نے حیرت بھری نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟''

''اوئے جھلیا......!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''پچھلے دو گھنٹے سے وقفے وقفے سے بارش کا جو سلسلہ جاری ہے اس نے...... کھرا نشان سب کا سوا ستیاناس پھیر دیا ہے۔ پانی میں ڈوبی ہوئی گیلی زمین پر کھوجی کیا خاک کھرا تلاش کرے گا......!''

''اوہ......!'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔''

''اپنے دھیان کو ریڈار کی طرح چاروں جانب حرکت دیتے رہا کرو۔'' میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تم پولیس والے ہو' کوئی سائنس دان نہیں جو تمہارا دھیان کسی ایک طرف لگا رہتا ہے۔''

''بس جی' غلطی ہو گئی۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''آئندہ میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

''پولیس کا محکمہ بہت زیادہ ہوشیاری اور چالاکی کا تقاضا کرتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''انسان کو ہر وقت آنکھ' کان اور دماغ کے دروازے کھلے رکھنا پڑتے ہیں۔''

''میں آپ کی نصیحت کو یاد رکھوں گا ملک صاحب......!''

''یاد رکھنے ہی میں تمہاری بھلائی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''ورنہ محکمے میں زندگی گزر جائے گی اور تم کانسٹیبل کے کانسٹیبل ہی رہو گے......''

افضل نے مجھے یقین دلایا کہ وہ زیادہ محنت اور لگن سے خدمات انجام دے گا۔ وہ محکمہ پولیس میں بہت زیادہ ترقی کا خواہاں تھا اور میں نے اسے ترقی کا گر بتا دیا تھا۔ ہمارے درمیان لگ بھگ آدھا گھنٹہ جیدا کی گمشدگی کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ افضل چونکہ مقامی تھا لہٰذا ان میں سے بہت ساری باتیں وہ بھی جانتا تھا جو خالدہ اور نذیر حسین کی زبانی مجھ تک پہنچی تھیں۔ اس کا بھی نذیر حسین کی طرح یہی خیال تھا کہ جیدا کی گمشدگی میں اس کے باپ علی نواز کا کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میں ذرا وکھری ٹائپ کا تھانیدار تھا اور میرے سوچنے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ میں کسی معمولی سے معمولی امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے افضل ہی کو بھیج کر اے ایس آئی مظفر کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مظفر میرے تھانے کا ایک ہونہار پولیس اہلکار تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے اسے بیٹھنے کیلئے کہا۔ وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔ ''مظفر تمہاری مصروفیات کیسی چل رہی ہیں؟''

''مصروفیات تو سب آپ کے سامنے ہیں ملک صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ حکم کریں......؟''

مظفر ایک کم گو' سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری مصروفیات میں' میں اضافہ کرنے والا ہوں۔ آج کا دن تمہیں میرے بغیر اس تھانے کا انتظام سنبھالنا ہوگا۔''

''آپ کہیں جا رہے ہیں؟'' مظفر نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں' میرا لاہور جانے کا ارادہ ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی نکلوں گا اور کوشش کروں گا رات تک واپس آ جاؤں اور...... میری واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"آپ بے فکر ہو کر جائیں ملک صاحب!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "انشاء اللہ! میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی مظفر......!"

"ملک صاحب! آپ خیریت سے لاہور جا رہے ہیں نا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"خیریت کہاں ہے مظفر......!" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں گمشدہ جیدا کے سلسلے میں اس کے باپ علی نواز سے ملنے جا رہا ہوں......!"

"ہوں......!" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

وہ مزید تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور ہمارے درمیان تھانے کے انتظامی امور کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی۔ ان دنوں تھانے میں زیادہ مصروفیات نہیں تھیں۔ جاوید عرف جیدا والا کیس اگست کے مہینے کا پہلا ایسا کیس تھا جس میں صحیح معنوں میں ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع مل رہا تھا......!



میں سہ پہر تین بجے لاہور میں تھا۔ سب سے پہلے میں نے متعلقہ پولیس آفس جا کر اپنی آمد کی غرض و غایت سے انہیں آگاہ کیا' پھر علی نواز کے گھر کا رخ کیا۔ نذیر حسین سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق علی نواز لاہور کے علاقے گڑھی شاہو میں رہتا تھا اور جب ایک سال پہلے نذیر حسین اس سے مل کر گیا تھا تو وہ کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا اور نذیر حسین کو اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بہت جلد فیکٹری کی ملازمت چھوڑ کر کوئی اور کام کرے گا' اسی خیال کے پیش نظر میں نے فیکٹری کے بجائے اس کے گھر کا رخ کیا تھا۔

گڑھی شاہو میں علی نواز کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں نے مطلوبہ دروازے پر جا کر دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے جی......؟"

آواز نسوانی تھی لہٰذا مجھے یہ اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہ آئی کہ وہ علی نواز کی بیوی

نورین ہوگی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور باآواز بلند کہا۔

"نورین بی بی! میں علی نواز سے ملنے آیا ہوں......"

"وہ تو گھر میں نہیں ہیں......"

"علی نواز کہاں گیا ہے؟"

"وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈیوٹی پر گئے ہیں۔"

"اس وقت ڈیوٹی پر......" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "کیا علی نواز آج کل رات کی ڈیوٹی کر رہا ہے؟"

"جی ہاں...... آپ کو نہیں پتا کیا......!" نورین کی متذبذب آواز ابھری۔ "وہ روزانہ اسی وقت جاتے ہیں اور آدھی رات کو واپس آتے ہیں۔" لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"آپ نے بتایا نہیں' کون ہیں...... آپ کو علی نواز سے کیا کام ہے؟"

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ "مجھے علی نواز سے بہت ضروری کام ہے۔ میں موضع شاہ پور سے آیا ہوں......"

"شاہ پور......!" الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

"ہاں' شاہ پور!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور میں وہاں کا تھانیدار ہوں......!"

"پولیس......!" اس کی گھبرائی ہوئی آواز نکلی۔ "آپ...... ہمارے دروازے پر کیوں آئے ہیں...... ادھر سب خیریت تو ہے نا......؟"

"پولیس کی آمد کا مطلب خیریت نہیں ہوتا نورین بی بی!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم دروازہ کھولو۔ مجھے تم سے بھی چند باتیں کرنا ہیں۔ میں گلی میں زیادہ دیر کھڑا رہا تو لوگوں کو تشویش ہوگی کہ تمہارے گھر پولیس کیوں آئی ہے......؟"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے میرے لئے دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نورین کی معیت میں اس کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔

وہ لگ بھگ تین مرلے رقبے پر بنا ہوا دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ آگے پیچھے

تھے۔ وہ ایک سادہ سی سجاوٹ والی عام بیٹھک تھی۔ میں نے بیٹھتے ہی نورین کا تنقیدی جائزہ لیا۔

وہ علی نواز کی دوسری بیوی تھی۔ میں اس کی پہلی...... بلکہ سابق بیوی خالدہ سے بھی مل چکا تھا۔ خالدہ کے مقابلے میں نورین کہیں زیادہ خوبصورت اور دلکش عورت تھی۔ علی نواز کا اس کی جانب جھکاؤ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

''آخر ہوا کیا ہے...... کچھ بتائیں تو سہی؟'' وہ پریشان لہجے میں بولی۔

''ہوا یہ ہے کہ علی نواز کا بیٹا جاوید عرف جیدا کہیں غائب ہو گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتانا شروع کیا۔ ''پورے شاہ پور میں اسے ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں علی نواز سے بات کرنے آیا ہوں۔''

''لیکن علی نواز کا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے۔ یہ تو پچھلے چار سال سے شاہ پور گئے ہی نہیں۔'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''جب سے انہوں نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دی ہے' اپنی سسرال والوں سے ہر رشتہ ناتا توڑ دیا ہے......''

''زبان سے قائم کئے گئے رشتے زبان سے توڑے جا سکتے ہیں نورین۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن خون کے رشتے ہر حال اور ہر قیمت پر بحال رہتے ہیں۔ علی نواز نے لاکھ خالدہ کو طلاق دے دی ہو اور کروڑ اپنی سسرال سے ناتا توڑ رکھا ہو اور چاہے وہ اپنے چاچا' چاچی سے بھی منہ موڑے بیٹھا ہو لیکن جیدا تو اس کا بیٹا ہے' اس کا خون ہے......!''

''ہاں...... آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانیدار جی پر......!''

''پر کیا؟'' اس نے جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ جی...... میری کئی بار علی نواز سے اس موضوع پر بات ہوئی ہے۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''لیکن وہ تو جیدا کو اپنا خون ہی نہیں سمجھتے......''

''میں اس کہانی سے بھی واقف ہو چکا ہوں۔'' میں نے کہا ''اور میں یہاں اس سلسلے میں کوئی ریسرچ کرنے نہیں آیا کہ علی نواز جیدا کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے یا نہیں...... میں تو یہ دیکھنے آیا ہوں کہ کہیں جیدا کی گمشدگی میں علی نواز کا ہاتھ تو نہیں......؟''

میرے انداز نے نورین کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں

بولی۔ ''علی نواز کیوں جیدا کو غائب کریں گے......؟''

''یہ تو میں اسی سے پوچھوں گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ذرا اس سے میری ملاقات تو ہو جائے......''

''علی نواز سے ملنا ہے تو آپ سینما چلے جائیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

''سینما؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں' وہ سینما ہی میں تو کام کرتے ہیں۔'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

''تو کیا فیکٹری کی نوکری اس نے چھوڑ دی؟''

''ہاں...... کافی دن ہو گئے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آٹھ دس ماہ سے تو وہ سینما جاتے ہیں...... اور رات کو دیر سے واپس آتے ہیں۔''

''وہ سینما میں کیا کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹکٹ وغیرہ دیتے ہیں......'' اس نے بتایا۔

میں نے سوال کیا۔ ''کس سینما میں؟''

نورین نے ایک سینما کا نام بتایا۔ گڑھی شاہو میں پہلو بہ پہلو دو سینماز بنے ہوئے تھے۔ ان کے نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ علی نواز ان ہی میں سے ایک میں ٹکٹ کلرک تھا۔ میں نے نورین کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''علی نواز سے تو میں سینما جا کر ہی ملاقات کر لوں گا کیونکہ میں آدمی رات تک یہاں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار تو کر نہیں سکتا۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہارے گھر کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

''سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ ''تاکہ اس بات کا اطمینان کر سکیں کہ کہیں خالدہ کے بچے جیدا کو ہم نے اپنے گھر میں تو نہیں چھپا رکھا......''

''اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو ایسا ہی سہی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

آئندہ پندرہ منٹ میں' میں نے اس مختصر سے مکان کا تفصیلی معائنہ کر لیا اور بلاشبہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ گھر جیدا کے وجود سے خالی تھا۔ ہم دوبارہ بیٹھک میں آ بیٹھے۔

''اب تو آپ کی تسلی ہو گئی نا؟'' نورین نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کسی گھر کے چھوٹے موٹے سروے سے اگر پولیس والوں کی تسلی ہونے لگے تو پھر سب کیس تھانے میں بیٹھے بٹھائے ہی حل ہو جائیں...... لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیدا کی گمشدگی کے بارے میں تو میں سینما جا کر علی نواز سے پوچھ گچھ کر ہی لوں گا...... تم ذرا مجھے علی نواز کی گمشدگی کے بارے میں تو بتاؤ؟"

"علی نواز کی گمشدگی؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں سمجھی نہیں تھانیدار صاحب...... علی نواز کہاں گم ہو گیا ہے؟"

"لاہور میں!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "وہ علی نواز جو شاہ پور سے ملازمت کی تلاش میں شہر لاہور آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔"

اس نے متذبذب انداز میں مجھے دیکھا تاہم منہ سے کچھ نہ بولی۔

میں نے کہا۔ "نورین بی بی! میں تمہاری اور علی نواز کی شادی کی کہانی سننا چاہتا ہوں......؟"

وہ چند لمحات تک خاموش رہ کر اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے خیالات کو ایک نقطے پر مرکوز کرتی رہی' پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں مجھے اپنی کہانی سنانے لگی۔ میں نورین کی داستان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

نورین اپنی بوڑھی ماں سلطانہ کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھی۔ عرصہ پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ گھر ان کا اپنا تھا لہٰذا نورین کے باپ اکرام اللہ کی وفات کے بعد ان ماں بیٹی کیلئے رہائش کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ ان کیلئے ایک کمرہ کافی تھا چنانچہ سلطانہ بی بی نے بیٹھک کو کرائے پر دے دیا' جس سے ایک مخصوص رقم گھر میں آنے لگی۔ علاوہ ازیں وہ گھر پر بچوں اور عورتوں کے کپڑے سلائی کر کے بھی کچھ پیسے کما لیا کرتی تھی۔ اس کام میں نورین بھی اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی' جس کے نتیجے میں بڑے اچھے انداز میں ان کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ انہیں کبھی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

گھر کی بیٹھک میں' مختلف ادوار میں مختلف کرایہ دار آ کر رہائش اختیار کرتے رہے تھے۔ انہی کرایہ داروں میں علی نواز سب سے آخری ثابت ہوا تھا۔ علی نواز کسی فیکٹری میں

ملازم تھا اور اس نے سلطانہ بی بی کی بیٹھک کرائے پر لے رکھی تھی۔ اسی قیام کے دوران میں علی نواز اور نورین کے بیچ پسندیدگی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ علی نواز نے نورین یا سلطانہ بی بی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور گاؤں میں اس کی بیوی اور بچہ بھی ہے۔

سلطانہ بی بی کی صحت خراب رہنے لگی تو اسے اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر ہوئی۔ وہ نورین اور علی نواز کے درمیان پسندیدگی کے پروان چڑھتے ہوئے جذبات سے بے خبر نہیں تھی لہٰذا ایک روز اس نے علی نواز سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس "صاف صاف بات" کے نتیجے میں نورین اور علی نواز کی شادی ہو گئی۔ ان کی شادی کے دو ماہ بعد سلطانہ بی بی کا انتقال ہو گیا۔ اب نورین اور علی نواز اس گھر کے مالک و مختار بن گئے تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد علی نواز نے نورین کو خالدہ اور جیدا کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

نورین کو حقیقت جان کر اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا افسوس اسے علی نواز کے جھوٹ بولنے پر ہوا تھا۔ بہر حال علی نواز نے کسی طرح منت خوشامد کر کے نورین کو منا لیا اور یہ وعدہ کیا کہ نہ صرف وہ خالدہ کو طلاق دے دے گا بلکہ کبھی پلٹ کر شاہ پور بھی نہیں جائے گا۔ نورین مطمئن ہو گئی۔

علی نواز نے طلاق کے حوالے سے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور پچھلے چار سال سے اس نے پلٹ کر شاہ پور کی طرف بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ نورین سے اس کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی کا نام مہوش تھا' جو اب تین سال کی تھی۔ اس سے چھوٹے بیٹے فراز کی عمر ڈیڑھ سال تھی۔ وہ دونوں اپنی ماں کی طرح خوش شکل اور پرکشش بچے تھے۔

میں نے مہوش اور فراز کو پیار کیا اور نورین کا شکریہ ادا کر کے اس کے گھر سے نکل آیا۔

شاہ پور واپسی سے پہلے میں نے متعلقہ سینما جا کر علی نواز سے بھی ملاقات کی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ عمر پینتیس کے آس پاس رہی ہو گی۔ اس کے بال سلکی تھے اور انہی بالوں کی ایک موٹی سی لٹ بار بار اس کے چہرے پر آ جاتی تھی۔

علی نواز کی ڈیوٹی ڈریس سرکل والی ٹکٹ ونڈو پر تھی۔ اس وقت ہال کے اندر شو چل رہا تھا لہٰذا وہ فارغ ہی بیٹھا تھا۔ میں نے وہاں پہنچ کر اپنا تعارف کرایا اور رسمی علیک سلیک

بعد اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ اس نے جیدا کی گمشدگی پر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا' بس افسوسناک انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

''علی نواز!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ایسا کیوں...... تمہیں جیدا کی گمشدگی کا دکھ کیوں نہیں ہوا...... وہ تمہارا خون ہے......؟''

اس نے زخمی نظر سے مجھے دیکھا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تھانیدار صاحب! اس ذکر کو چھوڑ ہی دیں تو اچھا ہے......''

''اگر اس ذکر کو چھوڑنا ہوتا تو میں شاہ پور سے سفر کر کے یہاں تک نہیں آتا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں جیدا کی تلاش میں تم تک پہنچا ہوں۔ میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا کہ جیدا کی گمشدگی میں تمہارا ہاتھ بھی ہوسکتا ہے لیکن جیدا والے معاملے کے علاوہ بھی میرا تم سے ملنے کا ایک خاص مقصد تھا......''

''خاص مقصد؟'' اس نے چونک کر سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہاں علی نواز...... یہ بات مجھے ادھر شاہ پور ہی میں پتا چل گئی تھی کہ تم جیدا کو اپنا خون تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو اور اس حوالے سے تم خالدہ کے کردار کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے جبھی تم نے اسے طلاق دی تھی۔''

''کہیں آپ اسی وجہ تے تو مجھ پر شک نہیں کر رہے تھانیدار صاحب!'' وہ فکرمندی سے بولا۔ ''آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں' میں جیدا کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ چاہیں تو میرے گھر کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں......''

''میں نے یہ چاہا تھا اور تمہاری اطلاع کیلئے بتاتا چلوں کہ میں تمہارے گھر کی تلاشی لینے کے بعد ہی ادھر آیا ہوں اور میں نے تمہاری بیوی کا بھی انٹرویو کرلیا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی میں تمہاری طرف آیا ہوں۔''

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے جیدا کی گمشدگی کے حوالے سے آپ کی تسلی ہوگئی ہے......؟''

''ہاں...... صرف جیدا کی گمشدگی کے حوالے سے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ابھی ایک اہم حوالہ باقی ہے اور اس حوالے سے صرف تم ہی میری

تسلی کرسکتے ہو......''

''کون سا حوالہ تھانیدار صاحب؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں خالدہ کے کردار پر کیوں شک تھا اور یہ کہ تم جیدا کو اپنا خون تسلیم کرنے سے گریزاں کیوں ہو......؟''

''آپ نے اس موضوع کو چھیڑ ہی دیا ہے تو پھر سنیں۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے سوالات کے جوابات حاصل کئے بغیر جائیں گے نہیں۔''

''تمہیں بالکل درست یقین ہے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اس نکتے نے میرے ذہن میں اچھا خاصا انتشار پیدا کر رکھا ہے۔''

''میں بتاتا ہوں آپ کو سارا چکر۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ ساتھ ساتھ چائے بھی پیتے جائیں......''

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا کہ علی نواز نے میرے منع کرنے کے باوجود بھی چائے منگوالی تھی۔ میں نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک چسکی لینے کے بعد سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تھانیدار صاحب! میرے ماں باپ کا بہت پہلے انتقال ہوگیا تھا جب میں بہت چھوٹا سا تھا......''

''یہ ساری کہانی میرے علم میں آچکی ہے علی نواز!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے والدین اور گھر کے دوسرے لوگ خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور تمہاری پرورش چاچا چاچی نے کی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اپنی خالدہ سے شادی کے بعد کی کہانی سناؤ......؟''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''خالدہ سے میری شادی چاچا نذیر حسین کے زور دینے پر ہوئی تھی ورنہ چاچی عنایت کا تو کوئی اور ہی ارادہ تھا۔''

''تمہاری چاچی کا کیا ارادہ تھا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ اپنی بہن جمیلہ کی بیٹی نرگس سے میری شادی کرنا چاہتی تھی۔'' علی نواز نے میرے

سوال کے جواب میں بتایا۔ ''لیکن نرگس مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔''

''ناپسندیدگی کی وجہ؟''

''بس' مجھے اس کی آنکھیں بڑی عجیب لگتی تھیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس کو دیکھ کر میری ہنسی نکل جاتی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے' نرگس بھینگی تھی؟''

''بھینگی سے بھی دس ہاتھ آگے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''میری آخری معلومات کے مطابق' ابھی تک نرگس کی شادی نہیں ہوئی۔''

میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ لیا۔ ''یہ آخری معلومات تمہیں کب اور کس نے دی تھیں۔ تم تو پچھلے چار سال سے شاہ پور گئے ہی نہیں ہو......؟''

''کوئی ایک سال پہلے چاچا نذیر حسین مجھ سے ملنے لاہور آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس وقت میں ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ چاچا کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ نرگس ابھی تک بیٹھی ہوئی ہے۔''

''اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کیلئے اس کی زندگی کا ساتھی پیدا کر رکھا ہے' بس تلاش کرنے کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھے خالدہ کے کردار کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے......؟''

''جی...... میری خالدہ سے شادی ہوگئی۔'' وہ قصے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چاچی اس رشتے پر مجھ سے ناراض تھی کیونکہ میں نے اس کی بھانجی نرگس کو ٹھکرا دیا تھا۔ گھر میں ہلکی پھلکی نوک جھوک چلتی رہتی تھی اور پھر میں ملازمت کی تلاش میں لاہور آ گیا۔ زمینداری اور کھیتی باڑی میں میرا کبھی دل نہیں لگا تھا۔ شادی سے پہلے تو کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا لیکن ایک ذمہ دار شخص ہونے کے ناتے اب مجھے کچھ نہ کچھ لازماً کرنا تھا۔ گاؤں میں میرے لئے کچھ نہیں تھا لہٰذا روزگار کی تلاش میں' میں یہاں آ گیا......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''شادی کے دوسرے سال ہی جیدا پیدا ہوگیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس بچے میں وہ کشش محسوس نہیں ہوتی تھی جو ایک باپ کو اپنی اولاد کیلئے محسوس ہونا چاہئے۔ میں نے بہت سوچا' غور کیا اور پھر ایک حتمی نتیجے پر پہنچ گیا۔ میں نے مسئلے کا سبب ڈھونڈ نکالا تھا۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''تم نے کون سا سبب ڈھونڈا تھا؟''

''اس کا نام تھا اشتیاق......'' وہ پرخیال انداز میں بولا۔ ''میرے مسئلے کی جڑ صرف اور صرف اشتیاق ہی تھا۔''

''یہ اشتیاق کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس بندے کے بارے میں کچھ بتاؤ......''

''اشتیاق' نرگس کا چھوٹا بھائی ہے تھانیدار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''دونوں کی عمروں میں دو تین سال کا فرق ہوگا۔ اشتیاق پہلے کبھی کبھار ہی اپنی خالہ یعنی میری چاچی سے ملنے آ جایا کرتا تھا لیکن جیسے ہی میں نے لاہور کا رخ کیا' گھر میں اشتیاق کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ میں جب بھی شاہ پور جاتا' گھر میں سب سے زیادہ اشتیاق کا ذکر ہوتا تھا۔ یہ میرے لئے ناقابل یقین اور حیرت کی بات تھی کیونکہ پہلے ہر کوئی اشتیاق کو ملعون کیا کرتا تھا۔ وہ ایک آوارہ گرد اور لفنگا شخص تھا۔ سارا دن اپنے ہی جیسے آوارہ لوگوں کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ ایسے لفنگے کی گھر میں تعریفیں سن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ گھر کے دوسرے افراد کی مجھے زیادہ پروا نہیں تھی لیکن خالدہ کی زبان سے اس لفنگے کا بار بار نام سن کر مجھے بہت اذیت پہنچتی تھی۔ میں پورا مہینہ پردیس میں گزار کر ایک دو دن کیلئے خالدہ اور جیدا سے ملنے آتا تھا اور یہ لوگ مجھے پرائے پرائے سے نظر آتے تھے۔ میں کوئی بھی بات شروع کرتا تو خالدہ گھما پھرا کر قصے کو اشتیاق کی طرف لے جاتی اور اس کی بے جا تعریفیں کرنے لگتی۔ خالدہ کا یہ رویہ مجھے زہر لگنے لگا۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ جیدا بھی اشتیاق کے ساتھ بہت زیادہ ہلا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس کم آتا اور اشتیاق کی گود میں زیادہ چڑھا رہتا۔ میں کچھ عرصہ تک تو یہ بے ہودگی برداشت کرتا رہا' پھر میں نے خالدہ کو سمجھانے کا فیصلہ کر لیا......''

''تمہارے سمجھانے کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟'' وہ خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا۔

''ہونا تو یہی چاہئے تھا کہ خالدہ میری بات کو سنجیدگی سے سنتی لیکن نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ ''وہ میری بات سنتے ہی الٹا اشتیاق کی حمایت کرنے لگی۔ میں اس کا شوہر تھا لیکن ہر خوبی اسے اشتیاق میں نظر آتی تھی۔ بیوی کا ایسا رویہ کسی بھی شوہر کا دماغ خراب کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ تک ہمارے درمیان اس معاملے پر سرد جنگ چلتی رہی' پھر میں نے چپکے سے یہاں لاہور میں نورین سے شادی کر لی......'' وہ تھوڑی دیر کیلئے تھما' ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ایک سال کے اندر ہی پتا نہیں کیسے میری دوسری شادی کی خبر شاہ پور تک پہنچ گئی۔ اس دفعہ جب میں گاؤں گیا تو خالدہ نے میرے ساتھ جھگڑا کیا۔ میں نے بھی اس موقع پر اپنے دل کا سارا غبار نکال لیا۔ اشتیاق اور خالدہ کے تعلقات کے حوالے سے میرے دماغ میں جو جہنم دہک رہا تھا اس کی ساری آگ میں نے خالدہ پر اگل دی۔ گھر میں بڑا سنگین ہنگامہ ہوا۔ چاچی آستینیں چڑھا کر اشتیاق کی حمایت پر اتر آئی اور اس نے اعلان کر دیا کہ اشتیاق اس کا بھانجا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے گھر میں آنے سے نہیں روک سکتی۔ چاچا نے بھی خالدہ کے آنسوؤں کا پاس رکھا اور مجھے ہی سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سب پر لعنت بھیجی' خالدہ کو طلاق دی اور لاہور آ گیا۔ پھر میں نے پلٹ کر شاہ پور کی طرف نہیں دیکھا۔ میں یہاں نورین اور دونوں بچوں کے ساتھ بہت خوش ہوں اور ماضی کے کسی قصے کو دہرا کر اپنی زندگی میں تلخیاں نہیں بھرنا چاہتا۔ اگر آپ قانون کے محافظ نہ ہوتے تو شاید میں اس موضوع پر آپ سے کوئی بات نہ کرتا......''

میں نے چائے ختم کی' علی نواز کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور گڑھی شاہو کے پکچر ہاؤس سے نکل کر واپسی کیلئے لاری اڈے کی جانب روانہ ہو گیا۔



گزشتہ پوری رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی۔ میں صبح تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ میں نے جن دو سادہ لباس کانسٹیبلز کو شاہ پور کی سن گن لینے کیلئے روانہ کیا تھا ان میں سے ایک واپس آ گیا تھا اور فیاض نامی وہ پولیس اہلکار میرے لئے ایک سنسنی خیز اطلاع لے کر آیا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''ہاں بھئی فیاض! کیا خبر لائے ہو؟'' وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں نے پوچھا۔

''ملک صاحب! جس دن جیدا غائب ہوا ہے نا جی' اس سے ایک دن پہلے دو مشکوک افراد کو شاہ پور میں دیکھا گیا ہے۔'' فیاض نے بتایا۔ ''وہ اعجاز کی بہن خالدہ کا گھر ڈھونڈ رہے تھے......''

یہ اطلاع واقعی بے حد چونکا دینے والی تھی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور فیاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ دونوں مشکوک افراد کون تھے؟''

''جناب! ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے......''

''انہوں نے گاؤں کے کس بندے سے خالدہ کا گھر پوچھا تھا؟''

''شوکت علی سے......!''

''یہ شوکت علی کون ہے؟''

''شاہ پور کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔''

''کیا شوکت علی بھی ان دو بندوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا؟''

''نہیں جناب!'' کانسٹیبل نے نفی میں گردن ہلائی۔''وہ دونوں شوکت علی کیلئے بالکل اجنبی تھے۔اس سے پہلے شوکت نے انہیں شاہ پور میں یا شاہ پور سے باہر کہیں نہیں دیکھا۔''

''کیا شوکت علی نے ان مشکوک افراد کو خالدہ کے گھر کا پتا بتا دیا تھا؟''

''جی.....شوکت نے یہی بتایا ہے۔'' فیاض نے جواب دیا۔

''تم نے شوکت سے ان بندوں کے حلیے اور وضع قطع کے بارے میں سوال نہیں کیا؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ملک صاحب! میں شوکت علی کو اپنے ساتھ تھانے لے آیا ہوں۔'' کانسٹیبل نے جوش بھرے انداز میں بتایا۔''تاکہ آپ اس سے تفصیلی پوچھ گچھ کرسکیں۔''

''یہ تم نے عقلمندی کا کام کیا ہے.....'' میں نے ستائشی نظر سے فیاض کی طرف دیکھا' پھر تحکمانہ انداز میں کہا۔''شوکت کو میرے پاس بھیجو.....''

تھوڑی دیر کے بعد شوکت علی نامی وہ زمیندار میرے سامنے موجود تھا۔اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بعد اسے بیٹھنے کیلئے کہا۔وہ ہچکچاتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

شوکت علی کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔وہ عام شکل وصورت کا مالک ایک دیہاتی شخص تھا۔میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ دونوں بندے تمہیں کب اور کہاں ملے تھے؟''

''جس دن جیدا گم ہوا ہے اس سے پہلے والی شام۔'' شوکت نے جواب دیا۔''میں کھیتوں میں موجود تھا کہ انہوں نے مجھ سے اعجاز کریانے والے کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا۔خالدہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔میں نے انہیں گلزار بی بی کے گھر کا پتا بتا دیا۔بس جناب میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا.....''

''وہ دونوں تمہارے لئے اجنبی تھے۔'' میں نے شوکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''تم نے انہیں پہلے کبھی شاہ پور میں نہیں دیکھا.....؟''

''نہیں جی.....'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔''نہ شاہ پور کے اندر اور نہ ہی باہر کہیں.....''

''ان کے حلیے اور شکلیں وغیرہ تمہیں یاد ہیں؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

''اگر وہ دوبارہ تمہارے سامنے آجائیں تو تم پہچان لوگے.....؟''

''جی بالکل پہچان لوں گا۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''ان کے حلیوں کے بارے میں مجھے بھی بتاؤ.....؟''

''ان میں سے ایک دراز قد اور دبلا پتلا تھا۔رنگ سانولا' عمر تیس سال کے قریب۔'' شوکت علی نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔''اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی بنے ہوئے تھے جیسے دو تین راتوں سے جاگا ہوا ہو۔وہ خاصا الجھا ہوا اور بیزار نظر آتا تھا۔''

''اور دوسرا؟'' شوکت علی کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھ لیا۔

''دوسرا درمیانے قد اور متناسب بدن کا مالک تھا۔'' اس نے جواب دیا۔''اس کا رنگ گندمی اور عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہوگی۔اس بندے کے سر کے بال حد سے زیادہ سیاہ اور گھونگھریالے تھے۔''

''شوکت علی!'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔''تم نے بڑی وضاحت کے ساتھ ان کے حلیے بیان کئے ہیں۔اب ذرا ان کے لباس کے بارے میں بھی بتا دو۔''

''جی تھانیدار صاحب.....!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''سانولے رنگ کے لمبے تڑنگے آدمی نے بادامی رنگ پاپلین کا شلوار قمیض پہن رکھا تھا جبکہ گھونگریالے بالوں والے کے جسم پر لٹھے کا لباس تھا.....کرتہ اور شلوار!''

''شوکت علی!'' میں نے سوال کیا۔''تم نے ان کے نام وغیرہ نہیں پوچھے تھے؟''

''جی' میں نے پوچھا تھا لیکن انہوں نے نام بتانے کے بجائے کچھ اور ہی جواب دیا۔'' وہ سادگی سے بولا۔''پھر میں نے انہیں کریدنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنے کھیتی باڑی کے کام میں مصروف ہوگیا.....''

''انہوں نے ایسا کیا جواب دے دیا تھا شوکت علی کہ تمہاری بولتی بند ہوگئی۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ.....'' شوکت نے جواب دیا۔''ہم لاہور سے آئے ہیں۔علی نواز نے ہمیں بھیجا ہے۔خالدہ کو کوئی خاص اطلاع دینا ہے.....''

شوکت علی کی بات سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔فوری طور پر میرے اندر یہ خیال ابھرا.....وہ دونوں جو کوئی بھی تھے ان کا علی نواز سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوسکتا

تھا۔ میں کل ہی علی نواز سے مل کر آیا تھا اور اس ملاقات میں، میں نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس کی روشنی میں وہ جیدا کی گمشدگی میں ملوث نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر ان دو مشکوک اجنبی افراد نے علی نواز اور لاہور کا ذکر کیا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ علی نواز کو کسی چکر میں پھنسانے کی سازش کر رہے تھے اور عین ممکن تھا کہ جیدا کو انہی لوگوں نے کہیں غائب کر دیا ہو۔ اگر وہ علی نواز کے بھیجے ہوئے بندے ہوتے تو پھر یہ کبھی ظاہر نہ کرتے کہ انہیں علی نواز نے کسی ضروری کام سے خالدہ کے پاس بھیجا ہے۔ اگر وہ دونوں نامعلوم افراد میرے ہتھے چڑھ جاتے تو جیدا کی گمشدگی کا عقدہ حل ہوسکتا تھا۔

شوکت علی مجھے جتنی معلومات فراہم کر چکا تھا اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا لہٰذا مزید چند سوالات کے بعد میں نے اس اس ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

"شوکت علی! جب تک جیدا کی گمشدگی کا مسئلہ حل نہیں ہوجاتا تم شاہ پور گاؤں سے باہر نہیں جاؤ گے اور اگر تمہارا جانا بہت ہی ضروری ہوا تو پہلے تم تھانے میں آ کر مجھے اطلاع دو گے۔ اس کے بعد ہی کسی طرف کا رخ کرو گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟"

"جی، سمجھ رہا ہوں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "شاید آپ کو کسی حوالے سے مجھ پر شک ہو رہا ہے......"

"لگتا ہے، تم میری بات کو کچھ زیادہ ہی سمجھ گئے ہو......" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "ایسا کچھ بھی نہیں کہ مجھے کسی حوالے سے تم پر شک ہو۔ میں نے تمہیں محض اس لئے شاہ پور میں رکنے کی تاکید کی ہے کہ وہ دونوں مشکوک بندے کسی وقت بھی پولیس کے ہتھے چڑھ سکتے ہیں۔ ان کی شناخت کیلئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی، اس لئے تمہارا گاؤں میں موجود رہنا ضروری ہے۔"

شوکت علی نے ایک سکون بھری سانس خارج کی اور مجھے سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

میں نے فوراً کانسٹیبل فیاض کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ فیاض آیا تو میں نے اسے ان دو افراد کے حلیوں سے تفصیلاً آگاہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ...... نہایت ہی محتاط انداز میں یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس وضع قطع کے بندوں کو گاؤں میں اور کس کس نے دیکھا ہے۔ ہوسکتا ہے، اس طرح ان کا سراغ لگانے میں آسانی ہوجائے۔

فیاض نے میری ہدایات پر کماحقہٗ عمل کرنے کا یقین دلایا اور مجھے سلام کر کے رخصت

ہوگیا۔ میں نے مقامی کانسٹیبل افضل محمود کو اپنے پاس بلا لیا۔

"جی حکم ملک صاحب!" وہ میرے سامنے باادب باملاحظہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"افضل! تم اشتیاق کو جانتے ہو؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"کون سا...... اشتیاق ملک صاحب؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "شاہ پور میں تو تین چار اشتیاق ہیں......"

"میں نذیر حسین کی سالی جمیلہ کے بیٹے اشتیاق کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ وہ جس کی بہن نرگس بھینگی ہے......"

"اچھا اچھا...... وہ اشتیاق!" وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ کوئی خاص بات؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "بس، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس قسم کا بندہ ہے اور آج کل کس نوعیت کی مصروفیات میں لگا ہوا ہے......؟"

"بہت ہی نکما اور فضول قسم کا بندہ ہے وہ۔" کانسٹیبل نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اسے آوارگی ہی سے فرصت نہیں ہے، کرے گا کیا۔ جتنا زمین کے اوپر ہے اتنا ہی زمین کے اندر......"

"تمہارا مطلب ہے، وہ پستہ قامت ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"بس، تمہیں اشتیاق پر گہری نظر رکھنا ہے۔" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "اس کا وہ حصہ جو زمین کے اوپر ہے اس پر بھی اور جو حصہ زمین کے اندر ہے، اس پر بھی کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟"

"آپ کی بات سمجھ میں آ رہی ہے ملک صاحب!" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن یہ پتا نہیں چل رہا کہ اچانک اشتیاق پر نظر رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی......؟"

"یہ میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں......" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

پھر میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں کانسٹیبل افضل کو سمجھایا کہ اشتیاق پر نظر رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے۔ علی نواز کی زبانی ماضی کے جو حالات و واقعات

میرے علم میں آئے تھے ان کی روشنی میں اشتیاق کو چیک کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر میں نے افضل سے کہا۔

''افضل! ابھی اور اسی وقت سے تمہاری ڈیوٹی اشتیاق پر ہے۔ تم نے اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنا ہے۔ وہ کس کس سے ملتا ہے اور ان کے بیچ کیا معاملات طے پاتے ہیں وہ تمہیں خبر ہونا چاہئے۔ اگر اشتیاق گاؤں سے باہر کہیں جانے کی کوشش کرے تو تم اس کا تعاقب کرو گے اور ضرورت پڑنے پر اسے گرفتار بھی کر سکتے ہو...... خاص طور پر میں نے جن دو اجنبی مشکوک افراد کے بارے میں بتایا ہے نا‘ اس حوالے سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر اشتیاق اور ان لوگوں کے بیچ کوئی کنکشن نکل آئے تو فوراً مجھے بتانا ہے......''

''جی ملک صاحب...... آپ فکر ہی نہ کریں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں اس سلسلے میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے امید ہے‘ تم جلد ہی کوئی خوشخبری سناؤ گے......''

''ان شاءاللہ......!'' وہ بڑے عزم سے بولا۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ ''افضل! تم نے ایک کام کرنا ہے......''

وہ رک گیا اور پوچھا۔ ''حکم ملک صاحب......؟''

''خالدہ کے بھائی اعجاز اور علی نواز کے چچا نذیر حسین سے کہنا کہ وہ آج کسی وقت تھانے آ کر مجھ سے ملیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھیجتا ہوں انہیں......'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''ملک صاحب! وہ دونوں ایک ساتھ آپ کے پاس آئیں یا......''

''جیسے بھی......!'' میں نے کہا۔ ''بس‘ تم انہیں میرا پیغام دے دو۔ یہ فیصلہ میں خود کروں گا کہ انہیں ایک ساتھ اپنے کمرے میں بلانا ہے یا الگ الگ......''

''ٹھیک ہے ملک صاحب‘ جو آپ کا حکم۔'' وہ بڑی فرمانبرداری سے بولا۔

افضل کے جانے کے بعد میں جیدا کی گمشدگی پر ایک نئے زاویے سے غور و خوض کرنے لگا۔ مجھے اس شخص کی تلاش تھی جو علی نواز کو اس واردات میں ملوث کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اگر وہ دونوں مشکوک افراد علی نواز کے بھیجے ہوئے ہوتے تو وہ کبھی یہ ظاہر نہ کرتے کہ انہیں علی نواز نے بھیجا ہے۔ یہ کوئی دوسرا ہی چکر تھا اور مجھے اس چکر کے سرغنہ کا سراغ لگانا تھا۔



میں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوا تو ایک عمر رسیدہ شخص مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہ اپنی وضع قطع اور چال ڈھال سے ساٹھ کے پیٹے میں نظر آتا تھا۔ اس پر نگاہ گئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں اور کب...... یہ یاد نہ آ سکا۔

اس نے میرے سامنے بیٹھنے کے بعد جب اپنا تعارف کرایا تو میری الجھن دور ہو گئی۔

''تھانیدار جی!'' اس نے کہا۔ ''میرا نام برکت علی ہے۔ ادھر چھپڑ کے کنارے آپ سے ملاقات ہوئی تھی جب آپ نے جیدا کی تلاش میں لوگوں کو چھپڑ کے اندر چھوڑا ہوا تھا......''

مجھے سب یاد آ گیا۔ اس وقت برکت نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا تھا...... اگر بچہ اس چھپڑ میں ڈوبا ہوتا تو اب تک اس کی لاش اوپر آ چکی ہوتی۔ دوپہر سے اب تک کافی وقت گزر چکا ہے۔

''چاچا! میں نے برکت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے چہرے کے تاثرات سے لگتا ہے کہ تم کوئی الجھن لے کر میرے پاس آئے ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے تھانیدار جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں‘ آپ میری بات کا کیا مطلب نکالیں لیکن میں جو کچھ دیکھ کر آ رہا ہوں اس نے میرے دماغ کو الجھا دیا ہے۔ میں نے لکڑیوں والا گٹھر گھر میں پھینکا اور سیدھا آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''

''تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے چاچا؟'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''میں لکڑیوں کی تلاش میں جنگل کی طرف گیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''ہفتے میں ایک آدھ چکر میں جنگل کا لگا لیتا ہوں......''

میں اضطراری نظر سے اسے دیکھنے لگا کہ وہ آگے کون سا انکشاف کرتا ہے۔ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں لکڑیاں اٹھا کر جنگل سے واپس آ رہا تھا کہ میں نے ایک درخت کے نیچے ایک

چپل پڑی دیکھی ہے...... آٹھ سے دس سال تک کے بچے کی چپل!''

''جنگل میں چپل!'' میں نے چونک کر برکت علی کی طرف دیکھا۔ ''کسی آٹھ دس سال کے بچے کا جنگل میں کیا کام......؟''

''اس سوال نے تو میرا دماغ خراب کیا ہے تھانیدار صاحب!'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''پتا نہیں کیوں...... میرے اندر سے ایک آواز اٹھتی ہے کہ کہیں وہ چپل گمشدہ جیدا کی تو نہیں......''

''چاچا......!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اس چپل کی تفصیل بتاؤ؟''

''جناب...... وہ ہرے رنگ کی ہوائی چپل ہے جس کا ایک اسٹریپ جڑا ہوا ہے یعنی اس اسٹریپ پر موچی کے ہاتھ کا پیوند لگا ہوا ہے۔''

''اس چپل کے آس پاس تمہیں اور کچھ بھی نظر آیا؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ جنگل کے اس حصے میں جانا ہوگا جہاں تم نے وہ چپل پڑی دیکھی ہے......''

''ٹھیک ہے جناب......!'' وہ آمادگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کے ساتھ جنگل کی طرف جانے کو تیار ہوں۔''

موضع شاہ پور کے شمال اور جنوب میں تا حد نگاہ سرسبز و شاداب کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ مشرق میں ایک فرلانگ کے فاصلے پر میرا تھانہ تھا۔ اس تھانے سے نصف میل آگے ایک نیم پختہ سڑک تھی جو لاہور کی جانب جانے والی سڑک سے جا ملتی تھی جبکہ شاہ پور کے مغرب میں دو فرلانگ کے فاصلے سے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی دس میل تک دراز ایک چھوٹا مگر گھنا جنگل تھا۔ گاؤں کے لوگ ایندھن کی تلاش میں اسی جنگل کا رخ کرتے تھے اور برکت علی بتا رہا تھا کہ اس نے اسی جنگل کے ایک حصے میں کسی بچے کی ہوائی چپل پڑی دیکھی تھی۔

اگر وہ چپل گمشدہ جیدا کی تھی تو پھر اس بات میں ں شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ جیدا کو کسی نے اسی جنگل میں گم کیا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ خود تن تنہا دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے جنگل کی طرف گیا ہو اور پھر اپنی چپل وہاں پھینک کر کہیں روپوش ہو گیا

ہو۔

میری یہ سوچ اس نقطے پر منحصر تھی کہ وہ چپل جاوید عرف جیدا ہی کی ہو۔ اگر میں مذکورہ چپل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو خالدہ کو وہ چپل دکھا کر شناخت کرائی جا سکتی تھی اور...... چپل تک رسائی حاصل کرنے کیلئے جنگل کی طرف سفر کرنا لازمی تھا۔

میں نے ضروری تیاری کی اور برکت علی کی رہنمائی میں جنگل کی جانب روانہ ہونے لگا تو کانسٹیبل افضل میرے پاس پہنچ گیا۔

''ہاں بھئی! خیریت تو ہے......'' میں نے اس پر نگاہ پڑتے ہی پوچھ لیا۔ ''تم خلاف توقع اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے؟''

''کیسی اطلاع؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے آپ کے حکم کے مطابق نذیر حسین کو تو تھانے آنے کیلئے کہہ دیا ہے اور وہ میرے ساتھ تھانے آ بھی گیا ہے۔'' افضل نے رپورٹ پیش کرنے والے انداز میں بتایا۔ ''لیکن اعجاز گھر پر موجود نہیں۔ اس کی گھر والی فریدہ نے بتایا ہے کہ وہ کسی ضروری کام سے کوٹ مکھن گیا ہے اور اس کی واپسی کل ہی ہو گی......''

کوٹ مکھن، موضع شاہ پور سے کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں نے افضل کی بات پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''اعجاز کی گھر والی نے یہ نہیں بتایا کہ اسے کوٹ مکھن میں ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا تھا؟''

''میں نے فریدہ سے یہ سوال کیا تھا'' افضل نے جواب دیا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ وہاں کے ایک بندے سے اعجاز نے کوئی رقم وغیرہ لینا تھی۔ وہ اسی رقم کی وصولی کیلئے وہاں گیا ہے......''

''چلو ٹھیک ہے...... وہ جب کوٹ مکھن سے واپس آئے گا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''یہ بتاؤ' نذیر حسین کہاں ہے؟''

''وہ باہر برآمدے میں بیٹھا ہے ملک صاحب۔''

''ٹھیک ہے' تم جاؤ افضل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں حسین کو خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔''

وہ مجھے سلام کر کے واپس چلا گیا۔

میں نے نذیر حسین کو بھی اپنے ساتھ رکھا اور چاچا برکت علی کی نگرانی میں ہم جنگل کی سمت روانہ ہوگئے۔ میں نے احتیاطاً برکت علی کو آگے چلنے کیلئے کہہ دیا تھا۔ اس سے میرا صرف اتنا سا مقصد تھا کہ میں نذیر حسین سے جو بھی گفتگو کروں وہ برکت علی کی سماعت تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔

''نذیر حسین!'' میں نے علی نواز کے چاچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کل لاہور گیا تھا......'' میں نے دانستہ آواز کو دھیما رکھا تھا۔

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور میرے ہی انداز میں آواز دبا کر بولا۔ ''آپ علی نواز سے ملنے گئے تھے؟''

''ہاں......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''تم نے یہ اندازہ کس بات سے لگایا ہے نذیر حسین؟''

''آپ نے مجھ سے علی نواز کا پتا وغیرہ لیا تھا'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اسی وقت محسوس ہوگیا تھا کہ آپ جیدا کی تلاش میں لاہور ضرور جائیں گے۔ میں پولیس کے طریق کار کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''پھر مجھے تم پر سخت افسوس ہے۔'' میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ ''بلکہ مجھے تم سے سنگین شکوہ ہے......''

''کس بات کا شکوہ اور کیسا افسوس تھانیدار صاحب؟'' وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''نذیر حسین! تم پولیس کے طریق کار سے واقفیت کے بھی دعویدار ہو اور تم نے مجھ سے بہت سے حقائق چھپانے کی کوشش بھی کی ہے......؟''

''کون سے حقائق تھانیدار صاحب؟'' اس کے تعجب میں اضافہ ہوگیا۔

''میں نے تم پر واضح کیا تھا نا کہ...... پولیس اور ڈاکٹر سے کوئی حقیقت نہیں چھپانا چاہئے ورنہ مصیبت الٹی اپنے ہی گلے میں آجاتی ہے......''

''جناب! میں نے آپ سے کیا چھپایا ہے؟'' وہ نیم احتجاجی انداز میں بولا۔ میرے پراسرار سوالات نے اس کی تشویش کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔

''جب میں نے تم سے خالدہ کی طلاق کا سبب پوچھا تھا تو تم نے بتایا تھا کہ علی نواز کو

خالدہ کے کردار پر شک ہوگیا تھا۔ وہ جیدا کو اپنا خون نہیں سمجھتا تھا؟''

''جی ہاں' میں نے آپ کو یہی بتایا تھا'' وہ گہری سنجیدگی سے...... ''اور حقیقت بھی یہی ہے تھانیدار صاحب......!''

''یہ آدھی حقیقت ہے نذیر حسین!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آدھی حقیقت!'' وہ مزید الجھ گیا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں جناب......؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ علی نواز کو خالدہ کے کردار پر شک ہوگیا تھا اسی لئے وہ جیدا کو اپنا خون تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم نے مجھ سے یہ حقیقت چھپائی کہ علی نواز کے شک کی بنیاد کون شخص تھا......؟''

''کون شخص؟'' اس نے الٹا مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔

''اشتیاق......!'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ وہ کھسیانا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''

''نہیں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''علی نواز کو اشتیاق ہی کے حوالے سے خالدہ کے کردار پر شک تھا۔''

''تو کیا علی نواز کا شک درست تھا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''دلوں کے حال اور نیت کا احوال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے تھانیدار صاحب!'' وہ ذو معنی انداز میں بولا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا اس لئے کسی پر الزام لگانا میں ٹھیک نہیں سمجھتا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے نا کہ اشتیاق اکثر و بیشتر تمہارے گھر میں گھسا رہتا تھا؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور وہ بھی علی نواز کی غیر موجودگی میں......!''

''جی ہاں' یہ ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ میری بیوی کا بھانجا ہے۔ میں اسے گھر میں آنے سے تو نہیں روک سکتا......؟''

''میں گھر میں آنے سے روکنے کی بات نہیں کر رہا ہوں نذیر حسین۔'' میں نے ایک ایک لفظ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس پر اور اس کی حرکتوں پر نظر رکھنے کی بات کر رہا ہوں......''

"جناب! میں نے کبھی اس حوالے سے غور نہیں کیا تھا۔" وہ خجالت آمیز انداز میں بولا۔

"وہ جیدا کو بیٹا بیٹا اور خالدہ کو بھابی بھابی کہتے نہیں تھکتا تھا اور ہر وقت ان کی خدمت میں لگا رہتا تھا......"

"اور اشتیاق کا یہی 'بیٹا بیٹا' اور 'بھابی بھابی' والا ڈرامہ علی نواز کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "غلط یا صحیح' میں اس بات کی بحث میں نہیں پڑوں گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتیاق کے اسی خدمت گارانہ رویے کی وجہ سے علی نواز کو خالدہ کے کردار پر شک ہوا تھا۔ اس نے بارہا یہ محسوس کیا تھا کہ خالدہ' اشتیاق کو اس پر اہمیت دیتی تھی اور جیدا بھی اسے نظرانداز کر کے اشتیاق کی گود میں گھسا رہتا تھا۔ جب علی نواز نے اس ایشو پر آواز اٹھائی تو تمہاری بیوی عنایت بی بی نے اشتیاق کی حمایت کی۔ اس موقع پر تم نے بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کے ساتھ ہی خالدہ نے علی نواز کی دوسری شادی کا معاملہ بھی اچھال دیا۔ وہ بے چارہ اپنی چاچی کے رویے سے تو پہلے ہی نالاں تھا۔ جب تم نے بھی اس کا ساتھ نہیں دیا تو اس نے خالدہ کو طلاق دی اور تم لوگوں کو اپنے ذہن و دل سے نکال کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لاہور کا ہو کر رہ گیا۔"

"میں تو یہی کہوں گا کہ جی گڑے مردے اکھاڑنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" وہ ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بولا۔ "جو کچھ ہوا' بہت برا ہوا......!"

نذیر حسین کے یہ شکست خوردہ کلمات اس بات کا بین ثبوت تھے کہ علی نواز غلطی پر نہیں تھا۔ اس نے جو بھی فیصلہ کیا تھا وہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا۔ اس تمام فتنے اور فساد کی جڑ صرف اور صرف اشتیاق ہی تھا۔

میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔ "نذیر حسین!" میں نے رازدارانہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "میں نے سنا ہے' اشتیاق خالدہ کی طلاق کے بعد بھی اس کے گھر کے چکر لگاتا رہا تھا......؟"

میرا چھوڑا ہوا تیر عین نشانے پر جا کر لگا۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ نے ٹھیک سنا ہے تھانیدار صاحب' لیکن اشتیاق کی نیت صاف تھی۔"

"نیت صاف تھی...... کیا مطلب؟" میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اشتیاق' خالدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"یعنی وہ اپنے جرم پر مہر تصدیق ثبت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟"

"آپ کچھ بھی کہہ اور سمجھ لیں تھانیدار صاحب۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن اشتیاق کے مؤقف میں بھی جان تھی......!"

"اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کے اور خالدہ کے بیچ کبھی کوئی غلط رشتہ نہیں رہا تھا لیکن یہ خالدہ کی بدقسمتی کہ اس کی وجہ سے خالدہ کو طلاق ہو گئی۔" نذیر حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ خالدہ کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کا ازالہ کرنے کیلئے اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔"

"کیا خالدہ بھی اس سے شادی کرنے پر آمادہ تھی؟" میں نے ایک نہایت ہی حساس سوال کیا۔

"جی ہاں' وہ تو تیار تھی لیکن......!"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا نذیر حسین؟"

"خالدہ کا بھائی اعجاز اس رشتے کیلئے تیار نہیں تھا۔" نذیر حسین نے بتایا۔ "اس نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ یہ کام کسی بھی صورت نہیں ہو سکتا۔ اس کی بہن کو اشتیاق کی وجہ سے بدنامی اٹھانا پڑی اور طلاق کا طوق پہننا پڑا۔ اب اگر اسی شخص سے خالدہ کی شادی کر دی گئی تو پورا گاؤں یہی کہے گا کہ علی نواز کا شک سولہ آنے درست تھا......"

"مطلب یہ کہ خالدہ اور اشتیاق کی شادی نہ ہو سکی؟"

"جی ہاں......!" نذیر حسین نے جواب دیا۔

"پھر چار سال کا عرصہ گزر گیا......؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اور پھر چار سال کے بعد جیدا غائب ہو گیا؟" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

"کہیں آپ...... جیدا کی...... گمشدگی کا شک...... اشتیاق پر...... تو نہیں کر رہے...... تھانیدار صاحب؟" نذیر حسین کی جھرجھراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "نذیر حسین! پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پٹرول سے آگے بڑھتی ہے۔ ایک اشتیاق کی کیا بات ہے' مجھے تو ہر اس شخص پر شک ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے جاوید اور عرف جیدا سے تعلق رکھتا ہو......" میں نے لمحاتی

توقف کرکے ایک گہری سانس لی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسی لئے میں نے لاہور جا کر سب سے پہلے علی نواز کو چیک کیا ہے۔ کیونکہ جیدا کے ساتھ سب سے زیادہ گہرا تعلق تو اسی کا بنتا ہے۔ جب علی نواز مجھے اس معاملے میں ملوث نظر نہیں آیا تو میں نے اپنی تفتیش کو شاہ پور تک محدود کردیا ہے اور اللہ کے فضل وکرم سے مجھے اس سلسلے میں ابتداہی میں دو بڑیاں کامیابیاں حاصل ہوگئی ہیں۔"

"کون سی دو کامیابیاں؟" نذیر حسین نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ایک کامیابی تو تمہیں ابھی جنگل میں پہنچنے کے بعد نظر آجائے گی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اور دوسری کامیابی کے بارے میں، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

میں نے دو مشکوک افراد کا ذکر دانستہ گول کردیا تھا۔ نذیر حسین نے ہیجان بھرے لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے، آپ بہت جلد جیدا کو ڈھونڈ نکالیں گے؟"

"ان شاء اللہ!" میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

سہ پہر چار بجے ہم نے جنگل میں قدم رکھ دیا۔

"چاچا برکت!" میں نے اپنے رہنما کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہمیں جنگل کے اندر کتنی دور تک جانا ہوگا؟"

"زیادہ دور نہیں جناب۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ سو گز آگے۔ آپ لوگ میرے پیچھے آئیں......"

میں اور نذیر حسین اس کے پیچھے ہولئے۔ برکت علی نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسی نوے گز آگے وہ مقام آگیا جہاں کسی بچے کی ہوائی چپل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے چپل کے دونوں پاؤں اٹھا کر بغور ان کا جائزہ لیا۔ وہ آٹھ سے دس سال کے کسی بچے کی چپل تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنا کم عمر کوئی بچہ خود ہی گاؤں سے تن تنہا اس جنگل کی طرف آنکلا ہو اور چپل یہاں چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا ہو۔

یہ جس بچے کی چپل تھی اسے یقیناً زبردستی اٹھا کر یا بے ہوش کر کے جنگل کی طرف لایا گیا تھا۔ گاؤں میں صرف ایک بچہ گم تھا اور وہ تھا جیدا لہٰذا بڑی مضبوطی کے ساتھ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ یہ چپل جیدا ہی کی ہوگی۔

میں نے وہ چپل نذیر حسین کو دکھا کر پوچھا۔ "اس چپل کو پہچانتے ہو نذیر حسین؟"

اس نے بغور چپل کا جائزہ لیا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں جناب! میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"مجھے یقین ہے، جیدا کی ماں خالدہ ضرور اس چپل کے بارے میں وثوق سے بتائے گی۔" میں نے مذکورہ چپل کو ایک تھیلے کے اندر محفوظ کرتے ہوئے کہا۔

برکت علی نے پوچھا۔ "اب کیا ارادہ ہے تھانیدار صاحب؟"

"جنگل میں آگے جا کر چھان بین کرنے کا ارادہ ہے۔" میں نے جنگل کے اندرونی حصے کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور میرے لئے کیا حکم ہے جناب؟" برکت نے مجھ سے پوچھا۔

"چاچا! تمہارا کام پورا ہو چکا ہے۔" میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "واپس جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو بھی تمہاری مرضی ہے......"

"اگر آپ کو میری ضرورت نہیں تو میں گھر جانا چاہوں گا۔" وہ بڑی سادگی سے بولا۔

میں نے اسے واپس جانے کی اجازت دے دی اور خود نذیر حسین کے ساتھ جنگل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ میری نظریں کسی عقاب کے مانند چاروں جانب کا جائزہ لے رہی تھیں تاکہ جیدا کو ڈھونڈنے کیلئے کوئی اور سراغ ہاتھ لگ جائے لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

پھر اچانک بارش شروع ہوگئی۔ یہ ایک نئی افتاد تھی۔ میں نے مڑ کر اپنے عقب میں دیکھا تو چاچا برکت علی کہیں نظر نہ آیا۔ اسے واپسی کی راہ اختیار کئے پندرہ سے بیس منٹ ہوگئے تھے۔ وہ اب تک جنگل سے باہر نکل چکا ہوگا یا نکلنے ہی والا ہوگا۔

میں نے نذیر حسین سے کہا۔ "بارش تو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی ہے۔ آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں...... واپس چلتے ہیں......"

"میرا بھی یہی خیال ہے تھانیدار صاحب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر بارش اسی رفتار سے جاری رہی تو ہم جنگل میں پھنس بھی سکتے ہیں۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ جنگل کی بارش کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ویسے پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے بارشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ساون گزر چکا تھا اور اب بھادوں اپنی جوانی کی بہار

دکھلا رہا تھا۔

ہم نے متفقہ رائے سے واپسی کی راہ لی۔

راستے بھر ہمارے درمیان گمشدہ جیدے کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ نذیر حسین نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانیدار صاحب! آپ نے جیدا کی تلاش کے سلسلے میں اپنی دو کامیابیوں کا ذکر کیا تھا۔ ایک تو آپ نے اس چپل کی صورت میں دکھائی دی۔ آپ کا اندازہ ہے کہ یہ چپل جیدا کی ہوسکتی ہے لیکن......'' وہ سانس ہموار کرنے کیلئے متوقف ہوا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''آپ نے ابھی تک دوسری کامیابی کے حوالے سے مجھے کچھ نہیں بتایا؟''

''نذیر حسین!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے جو راز بانٹنے جارہا ہوں اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا......''

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میرے بھیجے کے اندر بہت ہی گہرا کنواں کھدا ہوا ہے۔ آپ اس میں جو بھی ڈالیں گے' کسی کو نظر نہیں آئے گا۔''

''شاباش نذیر حسین۔'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم بڑے کام کے بندے ہو......لو اب کام کی بات سنو......''

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ہم باتیں کرنے کے دوران میں واپسی کا سفر بھی جاری رکھے ہوئے تھے اور بارش نے بھی ایک لمحے کیلئے سانس نہیں لی تھی۔ ہمارے لباس پوری طرح بھیگ چکے تھے۔

نذیر حسین بڑی توجہ سے میرے بولنے کا منتظر تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتانا شروع کیا۔ ''میں نے دو ایسے مشکوک افراد کا کھوج لگا لیا ہے جن کا تعلق شاہ پور سے نہیں......''

''دو مشکوک افراد؟'' نذیر حسین نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں جو اجنبی افراد۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جس دوپہر کو جیدا غائب ہوا ہے اس سے ایک دن پہلے شام کے وقت ان دونوں افراد کو شوکت علی زمیندار کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں شوکت علی سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ان دونوں بندوں کو نہیں جانتا۔ انہوں نے شوکت علی سے جیدا کا گھر

پوچھا تھا...... وہ اس طرح کہ اعجاز دکاندار کی بہن خالدہ کا گھر کون سا ہے......اور پھر اس کے اگلے روز ہی جیدا شاہ پور سے غائب ہوگیا۔ مجھے پکا شک ہے کہ جیدا کی گمشدگی میں انہی دو مشکوک افراد کا ہاتھ ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک طویل سانس خارج کی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ان دونوں بندوں کی تلاش کیلئے اپنے تھانے کے عملے کو ہائی الرٹ کردیا ہے۔ مجھے امید ہے' میں بہت جلد ان بندوں تک پہنچ جاؤں گا۔''

نذیر حسین نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میں نے محسوس کیا' اس دوران میں اس کے چہرے کی رنگت میں نمایاں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ اس کے انداز میں سنجیدگی اور سنسنی خیزی پائی جاتی تھی۔

''تھانیدار صاحب! آپ کہیں ان دو بندوں کا ذکر تو نہیں کررہے جن میں سے ایک دراز قد سانولی رنگت کا ہے اور دوسرا گورا ہے۔ اس گورے بندے کے سر کے بال گھونگریالے ہیں......!''

''ہاں' ہاں......وہی۔'' میں نے رک کر حیرت بھری نظر سے نذیر حسین کو دیکھا۔ ''کیا تم انہیں جانتے ہو......؟''

''جانتا تو نہیں جناب......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مگر میں نے انہیں اسی شام دیکھا ہے جس کا آپ ذکر کررہے ہیں۔''

''کہاں دیکھا ہے......؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''اعجاز سے باتیں کرتے ہوئے......'' وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔

''اعجاز سے......؟'' میں نے دوبارہ چلتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں......وہ تینوں گاؤں سے باہر کھیتوں میں بہت گھل مل کر باتیں کررہے تھے۔'' نذیر حسین نے جواب دیا۔ ''مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اعجاز کے جاننے والے ہوں......''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نذیر حسین نے میرے ساتھ چلتے ہوئے قیاس آرائی کی۔ ''تھانیدار صاحب! آپ نے بتایا ہے نا' جیدا کی گمشدگی سے ایک دن پہلے' شام کے وقت ان دونوں بندوں نے شوکت علی زمیندار سے اعجاز کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔ میرا خیال ہے' وہ شوکت علی سے ملنے کے بعد اعجاز کے پاس آئے ہوں گے......''

''لیکن تم نے تو انہیں اعجاز کے ساتھ گاؤں سے باہر کھیتوں میں دیکھا تھا؟''

''جی ہاں' میں نے انہیں وہیں دیکھا تھا۔'' نذیر حسین نے جواب دیا۔

''اور وہ اعجاز کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔'' میں نے مزید تصدیق کی خاطر پوچھا۔''جس سے تم نے اندازہ لگایا کہ وہ اعجاز کے جاننے والے ہیں؟''

''جی ہاں' بالکل......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''میں نے اسی بات سے اندازہ لگایا تھا۔''

''اللہ کے بندے نذیر حسین!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔''اگر وہ دونوں مشکوک اجنبی اعجاز کے جاننے والے تھے تو پھر وہ اعجاز اور اس کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا کیوں پوچھ رہے تھے......''

''ہاں...... یہ بات بھی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا' پھر ایک دو بار گردن جھٹکنے کے بعد بولا۔''پتا نہیں کیوں' میرا دل کہتا ہے کہ وہ دونوں بندے اعجاز کیلئے اجنبی نہیں تھے...... آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے؟''

''کون سا کام؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ ان دونوں بندوں کے بارے میں اعجاز حسین سے پوچھیں نا۔'' وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔''پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا......''

ہم باتیں کرتے ہوئے جنگل سے باہر نکل آئے۔

''کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہو نذیر حسین!'' میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔''لیکن اعجاز حسین فی الحال شاہ پور میں نہیں ہے......''

''کیوں...... وہ کہاں چلا گیا؟''

''مجھے پتا چلا ہے' وہ کسی بندے سے ملنے کوٹ مکھن گیا ہوا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''وہاں اس کا کوئی دوست رہتا ہے۔ وہ اس کے پاس گیا ہے۔''

''اوہ......!'' نذیر حسین نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بولا۔''پھر تو فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا......''

''کیوں کچھ نہیں ہو سکتا......؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔''نذیر حسین! اگر اعجاز شاہ پور میں موجود نہیں تو اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں گا اور چپ چاپ اس کی واپسی کا انتظار کروں گا......؟''

''میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا جناب۔'' وہ اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے بولا۔''میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اعجاز گاؤں میں موجود نہیں تو پھر ان دو مشکوک بندوں کے بارے میں اس سے پوچھ گچھ نہیں کی جا سکتی......''

''جب اعجاز کوٹ مکھن سے واپس آئے گا تو میں...... اسے بھی دیکھ لوں گا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔''فی الحال تو میں گمشدہ جیدے کی ماں خالدہ کے پاس جا رہا ہوں......''

''کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟'' نذیر حسین نے پوچھا۔

''یہ مناسب نہیں ہو گا۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''تم دونوں خاندانوں کے درمیان پہلے ہی بہت ساری رنجشیں اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ وہ میرے ساتھ تمہیں دیکھ کر بھڑک بھی سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب' تو پھر میں اپنے گھر جاتا ہوں۔''

''ہاں...... تمہارے لئے یہی مناسب رہے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

جب ہم شاہ پور گاؤں میں داخل ہوئے تو ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ نذیر حسین اپنے گھر کی طرف چلا گیا اور میں نے خالدہ کے گھر کا رخ کیا۔ بارش اب مکمل طور پر تھم چکی تھی۔ شاید ہمیں جنگل سے نکالنے کیلئے ہی اس کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوا تھا۔

میں اس سے پہلے بھی خالدہ کے گھر آ چکا تھا۔ اس نے میری دستک پر دروازہ کھولا اور مجھے لے جا کر بیٹھک میں بٹھایا' پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولی۔

''تھانیدار صاحب! میرے جیدے کا کچھ پتا چلا؟''

میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔''ہاں...... کچھ پتا چلا تو ہے!''

''کیا پتا چلا ہے؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں موجود تھیلے کو کھولا اور بڑے ڈرامائی انداز میں وہ ہوائی چپل نکال کر خالدہ کے سامنے رکھ دی جو مجھے جنگل کے اندرونی حصے

سے ملی تھی۔

چپل پر نگاہ پڑتے ہی خالدہ ہیجانی انداز میں چلائی۔ ''یہ...... یہ چپل تو...... میرے جیدے کی ہے...... آپ کو یہ چپل کہاں سے ملی......؟''

میں نے اضطرابی کیفیت میں مبتلا جیدے کی ماں کے سوالات کے جوابات میں وہ تفصیل بیان کردی جو اب تک میری تفتیش کے نتیجے میں سامنے آچکی تھی۔ میری باتیں سن کر خالدہ روہانسی ہوگئی' پھر گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''تھانیدار صاحب! میرا جیدا مل تو جائے گا نا......؟''

''اللہ کے گھر سے بہتری کی امید رکھنا چاہئے۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں پوری شدومد سے تمہارے بیٹے کو تلاش کر رہا ہوں۔ کل صبح میں دوبارہ جنگل کی طرف جاؤں گا۔ آج تو طوفانی بارش نے میرا راستہ روک لیا' کل ان شاء اللہ! میں جیدا کا سراغ لگانے میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔''

میں مزید دس پندرہ منٹ تک خالدہ کے پاس بیٹھ کر تسلی دلاسے کی باتیں کرتا رہا' پھر اس کے گھر سے نکل آیا۔ فی الحال اسے تسلی ہی دے سکتا تھا کیونکہ ابھی تک صورتحال کھل کر میرے سامنے نہیں آئی تھی۔

نذیر حسین کے انکشاف نے میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا در وا کردیا تھا۔ جس شام زمیندار شوکت علی سے دو اجنبی مشکوک افراد نے اعجاز کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا' اسی شام نذیر حسین نے انہی دو مشکوک بندوں کو اعجاز کے ساتھ' کھیتوں میں گھل مل کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسا کھلا تضاد تھا کہ میری سوچ میں متعدد سوالات پیدا کر رہا تھا۔

علاوہ ازیں علی نواز نے مجھے اپنی سابق بیوی خالدہ اور اس کے مبینہ آشنا اشتیاق کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس ذکر کو اعجاز نے بالکل ہی گول کر دیا تھا۔ جب میں نے علی نواز کے چچا نذیر حسین سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اس نے چند ایک معاملات کی پردہ پوشی کرتے ہوئے باقی باتوں کی تصدیق کر دی تھی۔ مثلاً یہ کہ جب علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی اور وہ اپنے میکے آگئی تو اس کیلئے' اشتیاق نے رشتہ بھیجا تھا لیکن اعجاز نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اعجاز نے یہ تمام تر معاملات مجھ سے چھپائے تھے جس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔ اعجاز نے خالدہ اور علی نواز کے جھگڑے کے حوالے سے مجھے جو قصہ

سنایا تھا اس میں علی نواز کو قصوروار ٹھہرایا گیا تھا اور جیدے کی گمشدگی کے سلسلے میں بھی اس کے شک کا مرکز علی نواز ہی تھا۔ بہرحال' نذیر حسین کی فراہم کردہ تازہ ترین معلومات کے مطابق اعجاز کو بڑی باریک بینی سے چیک کرنا ضروری ہوگیا تھا تاکہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کی جاسکے کہ اس نے حقائق کو چھپانے کی کوشش کس مقصد سے کی تھی۔

اپنے اسی تجسس کی تسکین کیلئے میں نے تھانے جانے سے پہلے اعجاز کریانہ فروش کی بیوی فریدہ سے ملاقات کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تو مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ اعجاز اپنے کسی دوست سے ملنے کوٹ مکھن گیا ہوا تھا لیکن یہ جاننا بھی ضروری تھا کہ ایسا کون سا اہم کام تھا کہ ادھر شاہ پور میں اس کے بھانجے کی گمشدگی نے افراتفری مچا رکھی تھی اور وہ ادھر کوٹ مکھن کی سیر کو نکلا ہوا تھا؟



کوٹ مکھن' موضع شاہ پور سے صرف دو میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے اور میں شوکت علی کے ہمراہ اسی کوٹ مکھن کی جانب رواں دواں تھا۔ ہم دونوں الگ الگ گھوڑوں پر سوار اب تب میں کوٹ مکھن پہنچنے ہی والے تھے۔

خالدہ کے گھر سے اٹھ کر میں سیدھا اعجاز کے گھر پہنچا تھا اور میں نے وہاں اعجاز کی گھر والی فریدہ سے ایک بھرپور ملاقات کی تھی اور اسی ملاقات نے مجھے کوٹ مکھن کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

فریدہ پہلے تو مجھے دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ مجھے ایک پولیس اہلکار کی زبانی معلوم ہوچکا تھا کہ اعجاز اپنے کسی دوست سے ملنے کوٹ مکھن گیا ہوا ہے لیکن جب میں نے فریدہ سے اعجاز کے بارے میں سوال کیا تو وہ بوکھلا کر آئیں بائیں شائیں کرنے لگی تھی۔

پہلے اس نے کہا کہ اعجاز گھر میں نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے گا۔ میں نے جب اسے پولیس اہلکار سے ہونے والی بات کا حوالہ دیا تو وہ چونک اٹھی اور پٹڑی بدلتے ہوئے بولی...... ہاں' مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ وہ تو کوٹ مکھن گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد بھی میں نے جو سوال کیا' اس نے حواس باختہ جواب ہی دیا۔ جب میں نے تھوڑی سی سختی کی اور دو مشکوک افراد کے بارے میں استفسار کیا تو اپنی مکمل معذوری ظاہر کرتے ہوئے وہ بڑی عاجزی سے بولی۔

"تھانیدار جی! مجھے تو اعجاز نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے دوست فاروق مہر سے ملنے کوٹ مکھن جا رہا ہے۔ فاروق سے اس کا رقم کا کوئی لین دین ہے۔ وہ اپنی رقم وصول کرنے وہاں گیا ہے۔ اس کے سوا مجھے کسی بات کا پتا نہیں......!"

میں نے فریدہ سے اعجاز کے کوٹ مکھن والے دوست فاروق مہر کے بارے میں ممکنہ حد تک معلومات حاصل کیں اور اس کے گھر سے اٹھ آیا تھا۔ جب سے نذیر حسین نے مجھے اعجاز اور مشکوک افراد کی ملاقات کے بارے میں بتایا تھا' میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ اس معاملے میں ایک نہایت ہی اہم نکتہ تھا اور وہ یہ کہ اگر وہ دونوں مشکوک افراد اعجاز کے واقف کار تھے اور اس کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہے تھے تو پھر انہیں زمیندار شوکت علی سے خالدہ کے گھر کا پتا پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی اور یہی نکتہ مجھے موضوع شاہ پور سے کوٹ مکھن لے آیا تھا۔

ان دونوں مذکورہ مشکوک افراد کو شاہ پور میں مبینہ طور پر تین افراد نے دیکھا تھا۔ نمبر ایک نذیر حسین' نمبر دو اعجاز اور نمبر تین زمیندار شوکت علی نے۔ اعجاز کوٹ مکھن میں تھا اور میں نذیر حسین کو بوجوہ اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا لہٰذا زمیندار شوکت علی کو ساتھ لے آیا تھا۔ واقعات کی روشنی میں شاہ پور میں وہ دونوں بندے سب سے پہلے شوکت علی ہی سے ملے تھے۔ میں نے راستے میں ایک مرتبہ پھر شوکت علی سے دو امور کی تصدیق کر لی تھی۔ نمبر ایک' ان بندوں نے شوکت علی سے اعجاز کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔ نمبر دو' انہوں نے اپنے بارے میں شوکت کو بتایا تھا کہ وہ لاہور سے آئے ہیں۔ اعجاز کو پکا شک تھا کہ جیدے کی گمشدگی میں اس کے باپ علی نواز کا ہاتھ تھا جو کہ لاہور میں رہتا تھا۔ اب یہ معمہ اسی وقت حل ہوسکتا تھا جب اعجاز میرے روبرو ہوتا' اسی لئے میں نے پہلی فرصت میں کوٹ مکھن کا رخ کیا تھا۔

ہم ساڑھے آٹھ' پونے نو بجے کوٹ مکھن میں تھے۔ فریدہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں' میں نے اعجاز کے دوست فاروق مہر کا گھر ڈھونڈنے کیلئے مقامی لوگوں سے پوچھ تاچھ کی تو ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ کوٹ مکھن میں فاروق مہر نامی کوئی شخص رہتا ہی نہیں۔ ایک فاروق لوہار سے ملاقات ہوئی اور وہ شاہ پور کے اعجاز کریانہ فروش کو نہیں جانتا تھا۔ جب میں نے کوٹ مکھن کے لوگوں کو اعجاز کی وضع قطع اور حلیے وغیرہ سے آگاہ کیا تو ایک

شخص نے بتایا کہ ایسی شکل و شباہت کا ایک آدمی نواز کے گھر آیا ہوا ہے۔ میں معلومات فراہم کرنے والے اس بندے کو ساتھ رکھ کر نواز نامی شخص کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں ایک سنسنی خیز انکشاف میرا منتظر تھا۔

میری دستک کے جواب میں تھوڑی تاخیر سے دروازہ کھلا اور جس شخص نے ادھورا دروازہ کھول کر باہر جھانکا' شوکت علی نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

"تھانیدار صاحب!" شوکت علی کی سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ "یہ تو انہی دو بندوں میں سے ایک ہے' جنہوں نے مجھ سے خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا......"

پولیس کو دروازے پر دیکھ کر اور اپنے بارے میں' میرے ہمراہی کا تبصرہ سن کر وہ بندہ ایسے اچھلا جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میکانکی انداز میں دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔

شوکت علی کے انکشاف نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر حد سے زیادہ چوکنا کر دیا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی دروازہ بند کرنے والی کوشش کو ناکام بنانے کیلئے دروازے کے بیچ میں پاؤں پھنسا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دروازے کو زوردار دھکا دیا۔

اس بندے کو میری جانب سے شاید ایسے فوری ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ دروازہ اس کے منہ پر لگا اور وہ پشت کے بل دھڑا سے گھر کے صحن میں گرا۔ میں اچھل کر اندر پہنچا تو سامنے اعجاز کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بندہ بھی تھا۔ شوکت علی نے فوراً سے پیشتر اس بندے کو بھی پہچان لیا۔ وہ دھکا کھا کر گرنے والے کا وہی ساتھی تھا' جنہوں نے جیدا کی گمشدگی سے ایک رات پہلے شوکت علی سے خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔

اعجاز کو ان دو مشکوک افراد کے ساتھ دیکھ کر ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ رہی سہی کسر اس وقت جاتی رہی جب ان تینوں نے مجھے دیکھ کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی۔

میں بھلا انہیں کیسے نکل جانے دیتا۔ شوکت علی اور میں تو تھے ہی' ہمارے علاوہ چار پانچ اور افراد بھی گلی میں تماشا دیکھنے کیلئے موجود تھے۔ یہ لوگ اپنے گاؤں میں پولیس کی آمد پر بے پناہ تجسس میں مبتلا ہو گئے تھے اور ہمارے ساتھ چلتے ہوئے نواز کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ ان سب نے پولیس کی مدد کی اور پانچ منٹ کے اندر میں ان تینوں پر قابو پانے میں

کامیاب ہوگیا۔

رات گیارہ بجے اعجاز' نواز اور نواز کا ساتھی وحید میرے تھانے کی حوالات میں بند تھے۔ میں نے دو خوفناک صورتوں والے کانسٹیبلو کو حوالدار کی ''مدد'' اور ''مہمانوں'' کی ''خاطر مدارات'' پر مامور کیا اور خود جا کر اپنے کوارٹر میں اطمینان سے سوگیا۔ یہ اطمینان اس بات کا تھا کہ میں نے جیدے کی گمشدگی کا راز پالیا تھا اور...... یہ راز رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

اگلی صبح میں تھانے پہنچا تو حوالدار نے ان تینوں کو کسی ریکارڈ کی طرح بجنے کیلئے تیار کر دیا تھا۔ میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا اور سوال و جواب شروع کئے تو انہوں نے اپنے جرائم کا اقرار کرلیا۔ اعجاز کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ وہ گزشتہ رات گرفتاری کے وقت ہی بہت ڈرا سہا نظر آ رہا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ قبول کرنے کو تیار ہے۔ نواز اور وحید کو میرے تھانے کے عملے نے ''سیٹ'' کر دیا تھا۔

واقعات کے مطابق' اشتیاق کی خالدہ میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی دلچسپی نے اعجاز کو بہت اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسی شخص کی حرکتوں کے باعث اعجاز کی بہن خالدہ کو طلاق ہوئی تھی۔ اعجاز کے دل میں علی نواز کیلئے بھی بہت غم و غصہ تھا۔ اشتیاق کا رشتہ جب اعجاز نے بڑی شدت سے مسترد کر دیا تو وہ جیدے سے ملنے کے بہانے گھر کے چکر لگانے لگا تھا۔ اعجاز نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ خالدہ اپنے دل میں اشتیاق کیلئے نرم گوشہ رکھتی تھی۔ جیدے کی ولدیت اور خالدہ کی طلاق کے حوالے سے گاؤں میں اعجاز کی جو ذلت ہوئی تھی وہ اس کے دماغ کے پرخچے اڑا دینے کیلئے کافی تھی۔ وہ جیدے کیلئے اپنے دل میں شدید ترین نفرت رکھتا تھا جو اس بدنامی کی جڑ تھا۔ ان تمام مسائل کو حل کرنے کیلئے اس نے ایک شاطرانہ منصوبہ بنایا اور ایک تیر سے تین شکار کرنے کی کوشش کر ڈالی۔

نواز اور وحید کوٹ مکھن کے جرائم پیشہ تھے۔ اعجاز نے ان کی مدد سے جیدے کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ تیار کیا اور مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ جیدے کی گمشدگی میں علی نواز کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ اس کا منصوبہ تقریباً کامیاب ہو چکا تھا کہ بالکل آخری مراحل میں' میں نے اسکے عزائم کی تکمیل روک دی تھی۔

جیدے کی چپل کی بازیابی اور شناختی کے علاوہ نذیر حسین کے انکشاف نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جیدے کی گمشدگی میں انہی دو مشکوک افراد کا

ہاتھ تھا اور بعدازاں میرا یہ خیال سو فیصد سچ ثابت ہوا۔ جیدے کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے اعجاز نے نواز اور وحید کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری......!

اسی روز شام سے پہلے میں نے نواز اور وحید کی نشاندہی پر جنگل کے دور افتادہ حصے میں جا کر معصوم جیدا کی لاش دریافت کر لی۔ ان نامرادوں نے جیدے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ایک گڑھے میں دبا دیا تھا۔ یہ تمام تر مذموم کارروائی انہوں نے اعجاز کے ایما پر کی تھی۔ لہٰذا میں نے نواز اور وحید کے ساتھ ہی اعجاز کو بھی فٹ کر دیا۔ اس فتنے کا روح رواں وہی تھا۔

فساد تو فساد ہی ہوتا ہے اور اگر یہ فساد کسی جہالت کا رہین منت ہو تو پھر اس کی خطرناکی اور تباہ کاری کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا......!



انسان دشمن

رانی کے اغوا کی رپورٹ درج کروانے نصف درجن سے زیادہ لوگ تھانے پہنچے تھے۔
ان دنوں میں سعید آباد کے تھانے میں تعینات تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ مین روڈ سے لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ آمدورفت کیلئے تانگے اور بیل گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں جو ایک نہر کے کنارے بنی سڑک پر رواں دواں رہتی تھیں۔ میں نے فوراً ان لوگوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ جون کی آخری تاریخیں اپنے جوبن کی حدت سے علاقے کے ماحول اور فضا کو دہکا رہی تھیں۔ بعض اوقات تو حبس اس قدر بڑھ جاتا کہ سانس لینا دوبھر ہو جاتا۔ بہرحال' ہر موسم کی ایک اپنی ادا ہوتی ہے اور اس ادا کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

ابتدائی گفتگو میں' میں نے فوراً اندازہ قائم کرلیا کہ میرے پاس آنے والے افراد میں صرف دو بندے کام کے ہیں۔ میں نے انہیں کمرے میں رکھ کر باقی سب کو باہر بھیج دیا۔ میں نے جنہیں اپنے پاس روکا ان میں ایک تو رانی کا باپ شوکت علی تھا اور دوسرا سعید آباد ہی کا ایک رہائشی اللہ بخش تھا۔

میں نے شوکت علی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ' تمہاری بیٹی رانی کو کب اور کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟''

''ابھی...... کوئی دو گھنٹے پہلے جناب۔'' وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔ ''ادھر گاؤں ہی سے......!''

''کیا تم سعید آباد ہی کے رہنے والے ہو؟''

''ہم لوگ پرانا سعید آباد میں رہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ اصل سعید آباد گاؤں مین روڈ سے کوئی پانچ میل کی دوری پر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ' سڑک سے ایک میل کے فاصلے پر ایک اور سعید آباد وجود میں آ گیا تو اس کا نام ''نیا سعید آباد'' رکھ دیا گیا جبکہ پہلے والا سعید آباد ''پرانا سعید آباد'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔ میرا تھانہ نیا سعید آباد میں تھا جبکہ رانی کا اغوا پرانا سعید آباد میں ہوا تھا۔

''اغوا کنندہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اس کا نام گلاب خان ہے۔'' اللہ بخش نے جواب دیا۔ ''گلاب خان ایک جرائم پیشہ شخص ہے جناب......''

مجھے اس علاقے میں تھانیداری کرتے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا' مگر میں نے کبھی گلاب خان غنڈے کا نام نہیں سنا تھا۔ لہٰذا اللہ بخش سے سوال کیا۔

''کیا یہ گلاب خان پرانا سعید آباد کا باشندہ ہے؟''

''نہیں جناب......!''

''پھر......!'' میں نے اللہ بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کا تعلق کس علاقے سے ہے؟''

''علاقے کے بارے میں حتمی طور پر میں کچھ نہیں بتا سکتا جناب۔'' اللہ بخش نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''سنا ہے' کسی دور دراز گاؤں سے اس کا تعلق ہے لیکن وہ ہمارے علاقے میں سے اکثر گزرتا رہتا ہے۔''

''ہوں......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی' پھر شوکت علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''گلاب خان سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟''

''کوئی نہیں جناب۔'' وہ بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تو آج تک اسے دیکھا ہی نہیں...... اس کا مجھ سے کوئی بیر کیسے ہوسکتا ہے۔''

''جب گلاب خان کا تم سے کوئی بیر نہیں تو پھر اس نے تمہاری بیٹی کو کس خوشی میں اغوا کرلیا ہے؟'' میں نے شوکت علی کو تیز نظر سے گھورا۔

''بیر اور دشمنی کے بارے میں' میں بتاتا ہوں جی۔'' اللہ بخش نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو یاد ہوگا' چند روز پہلے دو لڑکیاں آپ کے پاس آئی تھیں۔ وہ آپ کو چند

مشکوک افراد کے بارے میں بتانا چاہتی تھیں جنہوں نے کھیتوں کے اندر کچھ چھپایا تھا......؟''

مجھے فوراً یاد آ گیا۔ چند روز پہلے میں نے اپنے جوانوں کے ساتھ نہر کے پل پر ناکہ لگایا ہوا تھا۔ مجھے خبر ملی تھی کہ کچھ جرائم پیشہ افراد اس راستے سے غیر قانونی مال ادھر سے ادھر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نہر کا مذکورہ پل پرانا سعید آباد سے بہت نزدیک تھا۔ ناکے کے دوران ہی دو لڑکیاں میرے پاس آئی تھیں اور انہوں نے بتایا تھا کہ کھیتوں کے اندر چند مشکوک افراد نے کچھ چھپایا ہے۔ میں فوراً ان لڑکیوں کے ساتھ مذکورہ مقام تک پہنچا تھا لیکن جب مجھے دقوعہ پر کچھ بھی نظر نہیں آیا تو میں نے الٹا انہی کو ڈانٹ دیا تھا۔

''ہاں' ہاں...... مجھے یاد ہے!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اللہ بخش کی طرف دیکھا۔ ''لیکن اس واقعہ کا رانی کے اغوا کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

''تعلق یہ ہے تھانیدار صاحب!'' اللہ بخش ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ان دو لڑکیوں میں ایک میری بیٹی شبنم اور دوسری رانی تھی......شوکت علی کی وہ بیٹی جسے اغوا کر لیا گیا ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا کہ گلاب خان نامی اس غنڈے کا رانی سے کیا تعلق؟''

''اصل تعلق کے بارے میں' میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا' مگر میرا اندازہ یہ ہے کہ......'' اللہ بخش نے بتانا شروع کیا۔ ''رانی اور میری بیٹی شبنم بڑی گہری سہیلیاں ہیں۔ یہ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ ہی نظر آتی ہیں۔ اس روز جب انہوں نے تین افراد کو کھیتوں میں کچھ چھپاتے دیکھا تب بھی یہ دونوں ایک ساتھ ہی تھیں' رانی نے تو گھر جا کر کچھ نہیں بتایا لیکن شبنم نے مجھے ساری کہانی سنا دی تھی۔ جب میں نے شبنم کی بات سنی تو مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ لوگ گلاب خان کے گروپ سے تو تعلق نہیں رکھتے......''

''کمال ہے......!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اللہ بخش! مجھ سے زیادہ تو تم گلاب خان اور اس کے بندوں کے بارے میں جانتے ہو بلکہ...... میں تو سمجھو جیسے کچھ جانتا ہی نہیں...... یہ بڑی عجیب سی بات نہیں ہے؟''

''مجھے بھی بس اتفاق ہی سے یہ معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔'' وہ بے خوفی سے بولا۔ ''میں بعد میں آپ کو اس کی تفصیل بتا دوں گا۔ فی الحال' رانی کو بازیاب کرنے کا مسئلہ درپیش

ہے اس لئے آپ میری بات توجہ سے سن لیں۔''

''توجہ ہی سے سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم بولتے جاؤ۔''

''آج جب رانی کو اغوا کیا گیا تو شبنم بھی اس کے ساتھ تھی۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''وہ دونوں نہر کے کنارے والے نیم پختہ راستے پر چل رہی تھیں کہ گلاب خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار وہاں پہنچ گیا۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے' وہ لوگ اپنے کسی مشن پر نکلے ہوئے تھے اور انہیں راستے میں یہ لڑکیاں مل گئیں۔ انہوں نے انہیں اٹھا کر گھوڑوں پر لادنے کی کوشش کی۔ شبنم جان بچا کر بھاگ نکلی اور رانی کو وہ اٹھا کر لے گئے۔ میرا خیال ہے' گلاب خان کو شک ہو گیا تھا کہ انہی لڑکیوں نے تھانیدار کو ان کی ''سرگرمی'' کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے تو یہ ایک انتقامی کارروائی لگتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے' تمہاری بیٹی شبنم......'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''رانی کے اغوا کی چشم دید گواہ ہے؟''

''جی یہی حقیقت ہے......'' اللہ بخش نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اللہ بخش! تمہارا تفصیلی انٹرویو تو میں بعد میں کروں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پہلی فرصت میں تمہاری بیٹی شبنم سے ملنا ہوگا تاکہ رانی کی بازیابی کیلئے کوئی جامع لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔''

''شبنم اس وقت گھر میں ہے جناب......!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہم سب پرانا سعید آباد جا رہے ہیں۔'' وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔



پرانا سعید آباد جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے' نیا سعید آباد کے شمال میں لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے کانسٹیبل رفیق کو اپنے ساتھ لیا اور اللہ بخش و شوکت علی کی معیت میں' ایک تانگے پر سوار ہو کر پرانا سعید آباد کی جانب روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم اصل سعید آباد یعنی پرانا سعید آباد نامی گاؤں کے اندر تھے۔

اللہ بخش کی رہنمائی میں ہم اس مقام پر پہنچے جہاں سے گلاب خان نامی غنڈے نے رانی کو اغوا کیا تھا۔ شبنم نے گھر جا کر اللہ بخش کو رانی کے اغوا کی کہانی من وعن سنا دی تھی۔

وہ جگہ کھیتوں کے کنارے ایک مقام تھا۔ یہ دراصل ایک کچی پگڈنڈی تھی جو کھیتوں کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نہر کے اس پل کی طرف جاتی تھی جہاں چند روز پہلے میں نے ناکہ لگایا تھا۔ اللہ بخش نے گلاب خان نامی غنڈے کے بارے میں جتنے وثوق سے بات کی تھی اس نے میرے ذہن میں ایک سنسنی سی جگا دی تھی۔ یہ شخص اگر گلاب خان کے بارے میں جانتا تھا تو پھر میرے لئے بہت کام کا ثابت ہوسکتا تھا۔ میں اللہ بخش کو ذہن میں رکھتے ہوئے جائے وقوعہ کے معائنہ میں مصروف ہوگیا۔

کچھ زمین پر مختلف انسانوں کے قدموں کے نشانات نظر آرہے تھے۔ چند جانوروں کے پاؤں بھی بڑے واضح بنے ہوئے تھے جن میں گھوڑوں کے سموں کو الگ شناخت کیا جا سکتا تھا۔ یہ تمام تر نشانات آپس میں اس طرح گڈمڈ تھے کہ ان سے کوئی مدد لینا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے گھوم پھر کر اس کچی پگڈنڈی کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا لیکن بادی النظر میں کھرے کھوج کا کوئی امکان دکھائی نہ دیا۔ پولیس کو وہاں مصروف کار دیکھ کر چند دیہاتی جمع ہوگئے تھے۔ میں نے ان سے بھی پوچھ گچھ کی' مگر کوئی کام کی بات سامنے نہ آسکی' جس کی مدد سے میں رانی تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔

میں نے نصف گھنٹے کے اندر موقع کی کارروائی کو نمٹایا اور اللہ بخش کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گیا۔ مغوی رانی کا باپ شوکت علی بھی وہیں چلا آیا تھا۔ موسم کی شدت کے پیش نظر اللہ بخش نے ہمارے لئے لسی پانی کا بندوبست کیا۔ میں نے کہا۔

''اللہ بخش! میں پہلی فرصت میں تمہاری بیٹی شبنم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''آپ لسی وغیرہ پئیں۔ میں شبنم کو بلا کر لاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

ہم اس وقت اللہ بخش کے گھر کے وسیع وعریض صحن میں' ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں دو چارپائیاں پہلے سے بچھی ہوئی تھیں۔ میرے لئے اللہ بخش نے ایک کرسی ڈال دی تھی۔ شوکت علی کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس گھر میں اللہ بخش اور اس کی بیٹی کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ برسوں پہلے شبنم کی ماں زینت کا انتقال ہوگیا تھا۔

گاؤں دیہات کے گھروں میں عموماً کشادگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اللہ بخش کا گھر کچھ زیادہ

ہی کشادہ نظر آتا تھا۔ صحن کے انواع واقسام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ مال مویشی بھی بندھے ہوئے تھے۔ شوکت علی نے مجھے بتایا کہ اللہ بخش پہلے شہر میں رہتا تھا۔ کافی عرصہ پہلے گاؤں میں آکر آباد ہوگیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اللہ بخش اپنی بیٹی کے ہمراہ ہماری طرف بڑھتا نظر آیا تو میں نے شوکت علی سے کہا۔ ''میں شبنم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں......!''

وہ فوراً سے پیشتر میری بات کی تہ میں پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے' تھانیدار صاحب! میں اپنے گھر چلتا ہوں۔ آپ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میری طرف آجایئے گا۔''

''تمہارا گھر کس طرف ہے شوکت علی؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی گلی میں ہے جی۔'' شوکت علی کے بجائے اللہ بخش نے جواب دیا۔ پھر شوکت علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھو نا......تم کہاں جارہے ہو؟''

''میں ذرا سائرہ کو جاکر تسلی دوں۔'' شوکت علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''رانی کی وجہ سے اس کا برا حال ہورہا ہے......!''

سائرہ' رانی کی ماں کا نام تھا۔ شبنم کی طرح رانی بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ میں نے شوکت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''شوکت علی! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا اور......ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میں سیدھا تمہاری طرف ہی آرہا ہوں۔''

وہ مجھے سلام کرکے تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔

شبنم اور اللہ بخش میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئے۔

میں نے پہلی نظر ہی میں شبنم کو پہچان لیا۔ چند روز پہلے وہ اپنی سہیلی مغوی رانی کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ شبنم متناسب القد' دبلی پتلی اور خوبصورت لڑکی تھی۔ عمر لگ بھگ بائیس سال رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں شے اس کی موٹی موٹی آنکھیں تھیں۔ وہ اپنی سہیلی کے اغوا پر خاصی افسردہ اور چپ چپ سی نظر آتی تھی۔

''بیٹی!'' میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے نہایت ہی نرمی سے کہا۔ ''اگر تم مجھ

سے تعاون پر آمادہ ہو جاؤ تو میں جلد از جلد تمہاری سہیلی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔"

"میں...... تعاون......؟" اس نے اپنی موٹی آنکھوں میں الجھن بھر کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں' مجھے تمہارا تعاون چاہئے۔" میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "رانی کو تمہارے سامنے اغوا کیا گیا ہے...... تم ہی مجھے بتا سکتی ہو' وہ کون لوگ تھے اور رانی کو کس طرف لے گئے ہیں......؟"

"وہ کل تین افراد تھے...... گھوڑوں پر سوار......" وہ سہمی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' لیکن ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جنہیں چند روز پہلے ہم نے کھیتوں میں کچھ چھپاتے ہوئے دیکھا تھا اور...... آپ کو بتانے ناکے پر گئی تھیں......"

"ان کی کون سی باتوں سے تمہیں اندازہ ہوا کہ یہ وہی لوگ تھے؟" میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

"تھانیدار صاحب!" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "چند روز پہلے جب میں اور رانی آپ کے پاس ان کی شکایت لے کر پہنچی تھیں تو ہم نے بہت دور سے انہیں بڑے پراسرار انداز میں کھیتوں کے اندر کچھ چھپاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے چہرے ہمیں واضح طور پر دکھائی نہیں دیئے تھے۔ آج جب ہم دونوں سہیلیاں کھیتوں کے ساتھ ساتھ کچی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے گاؤں کی طرف آ رہی تھیں تو تین گھڑ سوار ہمارے نزدیک آ کر رکے۔ ان میں سے ایک کا لیڈر نظر آتا تھا۔ ان کی باہمی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ وہی لوگ تھے......"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے ایسی کون سی باتیں کی تھیں......؟"

وہ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔ "ہم پر نظر پڑتے ہی ان کے سردار نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا...... یہ تو وہی لڑکیاں ہیں جنہوں نے تھانیدار سے ہماری شکایت لگائی تھی......"

"پھر کیا حکم ہے دادا......؟" اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے بڑے لوفرانہ انداز

میں پوچھا۔

دوسرا بولا۔ "گلاب خان...... ہم تو تیرے اشارے کے منتظر ہیں...... اتنی خوبصورت کبوتریوں کو چھوڑنا کفران نعمت ہے......"

"ٹھیک کہتے ہو......!" گلاب خان نامی اس غنڈے نے حریفانہ نظر سے ہماری طرف دیکھا اور تحکمانہ انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اٹھا لو ان دونوں کو...... ڈیرے پر جا کر ان کا معائنہ کریں گے......"

ان غنڈوں کے خبیثانہ عزائم کا اندازہ ہوتے ہی ہم نے دوڑ لگا دی۔ رانی کی بدقسمتی کہ وہ ایک ناہموار جگہ پر پاؤں پڑنے سے منہ کے بل گر پڑی۔ بھاگنے کے دوران میں ہمارے درمیان کافی فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں آگے اور رانی پیچھے تھی۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر میں رکی تھی۔ میں نے دیکھا' گلاب خان نامی غنڈے کے دونوں ساتھی رانی کو ڈنڈا ڈولی کر کے گھوڑے کے قریب لے گئے تھے۔ پہلے میرے ذہن میں آئی کہ مجھے آگے بڑھ کر رانی کو غنڈوں سے بچانا چاہئے پھر خیال آیا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ مجھے فوراً گاؤں والوں کو اس واقعہ کی اطلاع دینا چاہئے...... میں نے اندھا دھند گھر کی سمت دوڑ لگا دی......"

وہ لمحے بھر کیلئے متوقف ہوئی' ایک طویل سانس لی' پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"میں نے گھر پہنچ کر ابا کو رانی کے اغوا کے بارے میں بتا دیا۔ ابا نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور گلاب خان کے ذکر پر یہ گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا......"

میں نے شبنم کے قریب ہی بیٹھے ہوئے اللہ بخش کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔ اللہ بخش کے ہونٹوں پر مجھے بڑی پراسرار مسکراہٹ نظر آئی۔ اس مسکراہٹ میں گھمبیرتا بھی شامل تھی۔ میں اللہ بخش کو سٹینڈ بائی رکھ کر دوبارہ شبنم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"پھر...... پھر کیا ہوا......؟" میں نے شبنم سے پوچھا۔

"پھر...... میں اور ابا سیدھے رانی کے گھر پہنچے۔" وہ بتانے لگی۔ "رانی کی اماں اور ابا کو اس واقعہ کے بارے میں بتایا پھر...... میں واپس گھر آ گئی اور ابا باقی لوگوں کے ساتھ آپ کے پاس تھانے چلا گیا تھا۔"

"تم نے اپنی سہیلی رانی کے گھر رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" میں نے تیز نظر سے

شبنم کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''رانی کی ماں کو تسلی دلاسے کی ضرورت تھی اور اس موقع پر تم سب سے زیادہ موزوں ثابت ہو سکتی تھیں......؟''

''میں فوراً واپس نہیں آئی تھی!'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں کافی دیر تک رانی کے گھر میں موجود رہی تھی۔ اس کے بعد ہی اپنے گھر آئی تھی ویسے بھی......'' اس نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔

''ویسے بھی رانی کا گھر مجھ سے دور تھوڑی ہے۔ وہ بھی اسی گلی میں رہتی ہے...... میرا مطلب ہے' رہتی تھی۔ جب جی چاہے گا' میں دوبارہ وہاں چلی جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے......!'' میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''مجھے ان تین افراد کے حلیوں کے بارے میں وضاحت سے بتاؤ' جنہوں نے رانی کو اغوا کیا ہے......؟''

''یہی سوال ابا نے بھی کیا تھا......!'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''ایک بار مجھے بھی بتا دو......''

اگلے دو منٹ میں شبنم نے گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کے قد کاٹھ اور حلیوں کے بارے میں مجھے تفصیلاً بتا دیا۔ میں نے یہ صورتی معلومات اپنے دماغ کے ایک خاص خانے میں محفوظ کر لیں اور شبنم سے استفسار کیا۔

''جائے وقوعہ سے گھر کی طرف آتے ہوئے تم نے کس کس کو رانی کے اغوا کے بارے میں بتایا تھا؟''

''راستے میں مجھے صرف ایک آدمی ہی ملا تھا......علی مراد!'' میرے سوال کے جواب میں شبنم نے بتایا۔ ''بس' میں نے علی مراد ہی سے اس بات کا ذکر کیا تھا۔''

''تم نے جائے وقوعہ سے فوراً گھر کی سمت دوڑ لگا دی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں یہ تو پتا نہیں ہوگا کہ وہ غنڈے رانی کو کس طرف لے گئے تھے......؟''

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ مطلب یہ کہ اسے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد اسے فارغ کر دیا اور اس کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اللہ بخش! میں اب شوکت علی کے گھر جاؤں گا۔ تم علی مراد کو ڈھونڈ کر میرے پاس لے آؤ۔ میں اس بندے سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں......''

''ٹھیک ہے جی' چلیں۔'' اللہ بخش نے کہا۔

ہم اللہ بخش کے گھر سے نکل کر شوکت علی کے گھر کی جانب بڑھ گئے۔



اب تک کی ملاقات میں' میں نے جو محسوس کیا تھا اس کے مطابق اللہ بخش بہت ہی گہرا آدمی نظر آیا تھا۔ میں فرصت میں اس کا تسلی سے انٹرویو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ خصوصاً گلاب خان کے حوالے سے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوگا۔

میں شوکت علی کے گھر میں لگ بھگ دو گھنٹے تک موجود رہا اور گھما پھرا کر مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا' مگر ایسا کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا جسے تھام کر میں رانی تک رسائی حاصل کر سکتا۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ گلاب خان اور اسکے ساتھی انتقاماً رانی کو اٹھا کر کہیں لے گئے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ شبنم کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان لوگوں کی باقاعدہ ان لڑکیوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ رانی ان کی وقتی خفگی کا نشانہ بن گئی تھی۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں گلاب خان اینڈ کمپنی کا تعاقب کرنے کے بجائے گاؤں ہی میں بیٹھا لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا پھر رہا تھا۔ آپ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں کیونکہ آپ نہیں جانتے' رانی کے اغوا کو جب تک کتنا وقت گزر چکا تھا۔

جی ہاں...... جب مجھے رانی کے اغوا کی اطلاع دی گئی اس وقت اس واقعہ کو لگ بھگ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ یہ میں کم از کم وقت بتا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے' اس سے زیادہ وقت ہی گزرا ہوگا۔ ان حالات میں اندھا دھند کسی سمت دوڑ لگا دینا عقلمندی نہیں تھی۔ گلاب خان اور اس کے ساتھی اس دوران میں رانی کو جائے وقوعہ سے کافی دور پہنچا چکے ہوں گے لہٰذا مناسب سمت کا تعین کئے بنا منہ اٹھا کر کہیں بھی نکل کھڑے ہونا وقت برباد کرنے کے مترادف تھا اور میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا جبھی رانی تک رسائی حاصل کرنے کیلئے کسی سر کی تلاش میں تھا۔ اس سلسلے میں علی مراد نے بڑی حد تک میری مدد کی۔

علی مراد وہ بندہ تھا' جو شبنم کو جائے وقوعہ سے گھر کی جانب جاتے ہوئے راستے میں ملا تھا اور شبنم نے اسے رانی کے اغوا کے بارے میں بتایا تھا۔ میری ہدایت پر اللہ بخش' علی مراد کو

پکڑ کر شوکت علی کے گھر لے آیا تھا۔

علی مراد کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ واجبی سی صحت کا مالک ایک عام سا آدمی تھا۔ رسمی سوالات کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''علی مراد! کیا تم نے ان گھڑسواروں کو جاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟''

''جی ہاں......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب شبنم نے مجھے بتایا کہ رانی کو چند غنڈوں نے اغوا کرلیا ہے تو اس نے ایک جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ جب میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے اڑتی ہوئی دھول کے اندر دوڑتے ہوئے گھوڑے نظر آئے تھے......''

''تم نے اغوا کنندگان کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''جناب' یہ ممکن نہیں تھا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''وہ لوگ اتنی دور نکل گئے تھے کہ میں طوفان کی رفتار سے بھاگ کر بھی انہیں پکڑ نہیں سکتا تھا' اس لئے میں نے...... ان کے پیچھے جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا......''

''وہ رانی کو اٹھا کر کس طرف گئے تھے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''پلیا سے ادھر...... مغرب کی جانب......!'' علی مراد نے بتایا۔

''پلیا سے مغرب کی جانب...... کا مطلب تھا نہر سے قائمہ زاویہ پر۔ مذکورہ نہر شمالاً جنوباً بہتی تھی اور علی مراد اسی پلیا کا ذکر کر رہا تھا جہاں چند روز پہلے میں نے ناکہ لگایا تھا۔ پلیا سے مغربی جانب سرسبز وشاداب کھیتوں کا ایک طویل وعریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ انہی کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک کچا راستہ بنا ہوا تھا۔ رانی کو اغوا کرنے والے گھڑسواروں نے فرار کیلئے وہی راستہ اختیار کیا تھا۔

میری معلومات کے مطابق اس راستے پر کوئی آٹھ' نو یا دس میل آگے چاندنگر نامی ایک گاؤں پڑتا تھا۔ اگر اغوا کنندگان شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خط مستقیم میں گھوڑے دوڑاتے رہتے تو سیدھے چاندنگر پہنچ جاتے۔ گویا عارضی طور پر ہی سہی' اغوا کنندگان کی سمت کا تعین ہوگیا تھا۔

علی مراد کے پاس میرے لئے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے دو چار سوالات کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی۔

پھر میں نے شوکت علی کو اس کی بیٹی کی سلامتی اور بحفاظت واپسی کا یقین دلایا اور اللہ

بخش کو اپنے ساتھ لے کر رانی کے گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر میں نے اللہ بخش سے کہا۔

''تم ابھی میرے ساتھ تھانے چلو گے......؟''

''تھانے! اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔'' وہ کیوں جی......؟''

''تم سے مجھے بہت ضروری کام ہے اللہ بخش!''

''مم مگر......؟'' اس کے استفسار میں گھبراہٹ بھی شامل ہوگئی۔

''ڈرو نہیں اللہ بخش! میں نے اس کا ذہن صاف کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میں تمہیں کسی جرم کے سلسلے میں تھانے نہیں لے جا رہا بلکہ مجھے تم سے نہایت ہی ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا' تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں ذرا شبنم کو بتا آؤں جی......!''

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو بہت ضروری ہے۔''

اس نے ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں' اللہ بخش' کانسٹیبل رفیق تانگے پر سوار ہو کر تھانے کی طرف جا رہے تھے۔ میں اللہ بخش کے ساتھ تانگے کی عقبی نشست پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ کانسٹیبل رفیق اور کوچوان اللہ رکھا اگلی نشست پر موجود تھے۔ اس دوران میں' میں اللہ بخش سے بات چیت بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔

''اللہ بخش! تمہاری عمر کیا ہوگی؟'' میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

''جناب انچاس واں سال چل رہا ہے۔'' وہ بڑے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''اگلے سال پچاس ویں میں چلا جاؤں گا۔''

''ماشاء اللہ......!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اللہ جھوٹ نہ بلوائے...... تم چالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے ہو۔ تمہاری صحت بڑی عمدہ اور شاندار ہے۔''

وہ خوشی سے پھول گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اللہ بخش! تمہیں گھڑسواری تو آتی ہوگی؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''بڑی چنگی طراں......!''

''ہوں......!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''آپ نے گھڑ سواری کے بارے میں کیوں پوچھا۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''اس لئے کہ...... اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب......!''

''میں نے رانی کی تلاش کے سلسلے میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ تلاش چونکہ گھوڑوں پر سفر کرتے ہوئے جاری رکھی جائے گی اس لئے تمہارا گھڑ سوار ہونا ضروری ہے۔''

''اوہ......!'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''تم کس سوچ میں پڑ گئے؟'' میں نے اللہ بخش کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی سوچ نہیں جناب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بس' یہ سن کر بڑا عجیب سا لگا تھا کہ میں کسی مشن میں پولیس کی مدد کروں گا......''

''میں نے مذاق نہیں کیا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں رانی کی تلاش کے دوران میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''لیکن پہلے تم اس راز سے پردہ اٹھاؤ گے کہ گلاب خان نامی اس غنڈے کو تم کیسے جانتے ہو......؟''

اس کے ساتھ ہی میں نے کن انکھیوں سے اگلی نشست پر موجود کانسٹیبل رفیق اور کوچوان اللہ رکھا کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کو میں نے ایک دوسرے سے باتوں میں مگن پایا۔ میں اللہ بخش کے ساتھ اطمینان سے بات کر سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''شروع ہو جاؤ......'' وہ شروع ہو گیا۔

اللہ بخش نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا' میں اس کا خلاصہ اس کی زبانی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ بھی اللہ بخش کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں۔



''میں' اللہ بخش نوجوانی کے زمانے میں سعید آباد کو خیر باد کہہ کر شہر چلا گیا تھا۔ اس نقل مکانی کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ میں شہر میں سیٹ ہو کر شہری زندگی کا حصہ بن جانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کڑی محنت کرنا پڑی۔ میں نے بعض اوقات دن میں بیس بیس گھنٹے بھی کام کیا۔ مختلف ملازمتیں بدلنے کے بعد میں نے اپنا کام شروع کر دیا' پھر تو سمجھو...... چل سو چل۔'' اللہ تعالیٰ نے میرے کام میں برکت ڈالی اور میں ایک چھوٹا بزنس مین بن گیا۔ میں نے جوتوں کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا تھا۔

میرا بزنس دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ جب انسان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو تو سب سے پہلے وہ اپنے لئے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور شریف النفس مرد اپنا ساتھی بیوی کی شکل میں تلاش کرتے ہیں۔

میں نے بھی شادی کر لی۔ میری بیوی زینت بہت ہی سگھڑ اور فرمانبردار عورت تھی۔ وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھتی تھی۔ شادی کے لگ بھگ دو سال بعد میری بیٹی شبنم پیدا ہوئی' گویا...... ہماری زندگی مکمل ہو گئی۔

شبنم پانچ سال کی تھی کہ ہماری زندگی میں ایک انقلاب نے دستک دی۔ ٹریفک کے ایک حادثے میں شبنم کی ماں زینت کا انتقال ہو گیا۔ یہ میرے لئے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ میں رفیق زندگی سے محروم ہو گیا تھا اور شبنم کائنات کی سب سے شفیق اور مہربان ہستی ماں کو کھو بیٹھی تھی۔ ہم دونوں باپ بیٹی نے اپنی اپنی سطح پر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی' لیکن ناکام رہے۔ تھک ہار کر میں مشورے کیلئے اپنے ایک دوست کے پاس گیا۔

''امیر علی! میں نے واپس گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے......!'' میں نے اپنے دوست سے کہا۔

"پھر......؟" امیر علی نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"تم میرے ایسے دوست ہو کہ جس سے میں ہر بات بلا جھجک کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے مشورہ دو...... ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے......؟"

"جو شخص کسی فیصلے پر پہنچ چکا ہو اسے مشورہ نہیں دیا جاتا۔" امیر علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بس، اتنا کہوں گا کہ تمہارا کاروبار شہر میں سیٹ ہے تو تمہیں ادھر ہی رہنا چاہئے۔ گاؤں جا کر کیا کرو گے......؟"

"یار...... بات دراصل یہ ہے کہ زینت کی جدائی کے بعد میں خود کو اندر سے بڑا خالی محسوس کرنے لگا ہوں۔" میں جذباتی ہو گیا۔ "میرے اندر سے مسلسل ایک آواز ابھر رہی ہے کہ اس خلا کو پر کرنے کیلئے مجھے اپنے ماضی کی جانب سفر کرنا چاہئے۔ اسی لئے......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسی لئے میں نے باقی کی زندگی گاؤں جا کر گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے شہر میں رہتے ہوئے اتنا کما لیا ہے کہ اپنے آبائی گاؤں میں اچھی خاصی زمین خرید کر بڑی مطمئن زندگی شروع کر سکتا ہوں، پھر...... دو افراد کا آخر خرچہ ہی کتنا ہوتا ہے......"

امیر علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بتاؤ...... میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں......؟"

"یہ کی ہے نا تم نے کام کی بات۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ......" میں نے بتانا شروع کیا۔ "تم میرا چلتا ہوا بزنس خرید لو تا کہ مجھے جانے میں آسانی ہو۔ میں دوسروں کی نسبت کم پیسوں میں اپنا سارا کاروبار تمہارے حوالے کر دوں گا...... یہ بات میں گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سودے میں تمہیں گھاٹا نہیں ہو گا۔"

امیر علی بھی ایک کاروباری شخص تھا۔ اس کا گارمنٹس کا بزنس تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر تم نے شہر چھوڑ کر گاؤں جانے کا اٹل فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں اور...... یہ تم نے دوسروں سے کم پیسے لینے کی کیا بات کی ہے۔ تمہارے بزنس کی جو بھی مارکیٹ ویلیو ہو گی، میں تمہیں وہی دوں گا......" وہ لمحے بھر کیلئے تھما، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"گھر کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"ظاہر ہے...... وہ بھی بیچنا ہے......"

"ٹھیک ہے، تم اپنا کاروبار اور گھر میرے ہاتھ فروخت کر دو۔" امیر علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہم کل ہی تمہارے مکان اور کارخانے کی مارکیٹ ویلیو معلوم کر لیتے ہیں......"

اس طرح میں برسوں پہلے شبنم کو لے کر شہر سے گاؤں آ گیا تھا۔ میں نے یہاں آ کر ایک مناسب سا گھر اور کچھ زمین خرید لی اور راضی خوشی زندگی بسر کرنے لگا...... اب میں آپ کو گلاب خان وغیرہ کے بارے میں بتاتا ہوں......"

چند لمحات کا توقف کر کے اس نے دو تین گہری سانسیں لیں، پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے گاؤں میں مستقل رہائش تو اختیار کر لی تھی لیکن کبھی کبھار شہر کا چکر بھی لگ جاتا ہے۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ میں امیر علی سے ملنے شہر گیا ہوا تھا۔ وہاں کے ایک اخبار میں میں نے گلاب خان نامی ایک غنڈے کے بارے میں پڑھا۔ ان دنوں گلاب خان خبروں میں تھا۔ آئے روز اخبارات میں اس کی تصویریں بھی چھپتی رہتی تھیں۔ گلاب خان اسلحے اور منشیات کی سمگلنگ میں ملوث تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ گلاب خان ایک بین الاقوامی سمگلر کیلئے کام کرتا ہے۔ گلاب خان کا حلیہ اور صورت میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک ماہ پہلے میں نے گلاب خان کو اپنے گاؤں کے قریب سے گزرتے دیکھا تو چونک اٹھا۔"

اتنا بتا کر اللہ بخش خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا......؟"

"چند روز پہلے جب شبنم نے مجھے آ کر بتایا کہ اس نے اور رانی نے چند مشکوک افراد کو کھیتوں میں کچھ چھپاتے دیکھا ہے اور وہ اس واقعہ کی شکایت لے کر آپ کے پاس بھی گئی تھیں تو میں نے شبنم سے ان جرائم پیشہ افراد کے حلیوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جو حلیے بیان کئے ان میں ایک ہو بہو گلاب خان تھا۔ میں ایک ماہ پہلے گلاب خان کو اپنے علاقے میں دیکھ چکا تھا لہٰذا میرا دھیان فوراً اسی کی طرف چلا گیا اور آج...... آج وہی گلاب خان رانی کو اٹھا کر لے گیا ہے...... یہ ہے کل کہانی جناب!"

"ہوں......!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "تو اس کا مطلب ہے، مجھے جن جرائم پیشہ افراد کی تلاش ہے، وہ گلاب خان اور اس کے ساتھی بھی ہو سکتے ہیں۔ تم کیا بتا رہے ہو کہ...... گلاب خان اسلحے اور منشیات کی سمگلنگ میں ملوث ہے......؟"

"جی تھانیدار صاحب!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ پچھلے ایک ماہ کے اندر اس علاقے میں تین چار مرتبہ دیکھا گیا ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کہیں آس پاس ہی اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ اگر آپ سرگرمی سے اسے تلاش کریں تو رانی کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔"

"میں تو اسے ایسی سرگرمی سے تلاش کروں گا کہ تم دیکھتے رہ جاؤ گے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کا ٹھکانا جہاں کہیں بھی ہے' وہ مجھ سے بچ کر نہیں جائے گا۔"

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں بیان کیا ہے کہ چند روز پہلے میں نے سعید آباد والی نہر کے پل پر ناکہ لگایا تھا۔ مجھے اوپر سے ہدایات موصول ہوئی تھیں کہ میرے علاقے کے راستے غیر قانونی اسلحہ کی نقل و حمل ہونے والی ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں ناکہ لگایا تھا لیکن کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اب اللہ بخش نے جو تفصیل بیان کی تھی اس کی روشنی میں بہت ساری باتیں واضح ہوگئی تھیں۔

اس امر کی تصدیق شبنم اور رانی کی رپورٹ میں بھی ہوئی تھی۔ ناکے والے دن انہوں نے تین افراد کو کھیتوں کے اندر کچھ چھپاتے ہوئے دیکھا تھا' بعد میں اللہ بخش کی تصدیق سے پتا چلا کہ ان کا لیڈر گلاب خان تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس روز گلاب خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سعید آباد کے راستے کچھ غیر قانونی نوعیت کی سرگرمی کرنا چاہتا تھا اور نہر کے پل پر لگے ناکے نے اسے محتاط کر دیا تھا۔ لہٰذا اس نے "مال" کھیتوں میں چھپا دیا اور جب تک میں شبنم اور رانی کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچتا' وہ اپنے جرائم کے ثبوت کو نکال لے گیا' اس کی دیدہ دلیری اس بات سے ظاہر ہوتی تھی آج بھی وہ ادھر سے گزرا تھا اور رانی کو اٹھا لے گیا تھا۔ گویا' اس نے سعید آباد کو اپنی گزرگاہ بنا لیا تھا۔ مجھے پہلی فرصت میں گلاب خان تک پہنچنا تھا۔



جون کا مہینہ اپنے جوبن پر تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا اور اسی آسمان کے نیچے میں' اللہ بخش گھوڑوں پر سوار ہو کر سعید آباد کی مغربی سمت میں محو سفر تھے۔ علی مراد نامی شخص کی زبانی پتا چلا تھا کہ گلاب خان اور اس کے ساتھی غنڈے رانی کو اٹھا کر اسی سمت میں گئے تھے۔

میں اللہ بخش کو پہلے اپنے ساتھ تھانے لے آیا تھا اور ضروری تیاری کے بعد ہی ہم رانی کی تلاش میں روانہ ہوئے تھے۔ اللہ بخش چاق و چوبند اور بیدار مغز شخص تھا اسی لئے میں نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پرانا سعید آباد والے نہر کے پل سے مغرب کی جانب آٹھ نو میل کے فاصلے پر چاند نگر نامی ایک گاؤں واقع تھا۔ اگر ہم ناک کی سیدھ میں سفر کرتے رہتے تو کھیتوں کے بیچ بنا یہ کچا راستہ ہمیں چاند نگر تک لے جاتا۔ دوران سفر میں ہم آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے اطمینان کیلئے پوچھ لیا۔

"اللہ بخش! اگر گلاب خان اچانک تمہارے سامنے آ جائے تو کیا تم اسے پہچان لو گے......؟"

"تھانیدار صاحب! یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" وہ پر وثوق انداز میں بولا۔ "میں یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اسے دیکھتے ہی پہچان لوں گا۔"

"قانون پوری طرح تمہارے ساتھ ہے اللہ بخش!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر میں گلاب خان کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا تو میں تمہیں سرکار کی طرف سے انعام وغیرہ بھی دلواؤں گا......"

"ملک صاحب! میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔" وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "میں انعام وغیرہ لے کر کیا کروں گا اور میں کسی انعام کے لالچ میں آپ کے ساتھ ہوں

بھی نہیں...... میری خواہش ہے کہ شوکت علی کی بیٹی رانی جلد از جلد مل جائے۔''

''یہ میری بھی خواہش ہے اللہ بخش!'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''اسی لئے تو میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر اس قیامت خیز گرمی میں دوڑ دھوپ کر رہا ہوں......''

''جناب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' اللہ بخش نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''کون سی بات اللہ بخش؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہم لوگ رانی کی تلاش میں نکلے ہیں اور آپ رانی کو چھوڑ کر زیادہ ذکر گلاب خان کا کر رہے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں...... خاص وجہ ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا میں وہ وجہ جان سکتا ہوں؟''

''ہاں...... ضرور!'' میں نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔ آئندہ پانچ منٹ میں' میں نے اللہ بخش کو اپنے اس مشن کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا جس کی وجہ سے میں نے پچھلے دنوں نہر کے پل پر ناکہ لگایا تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور آخر میں کہا۔

''میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو جس جرائم پیشہ شخص کی تلاش ہے وہ گلاب خان کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم موضع چاند نگر پہنچ گئے۔ میں نے چاند نگر کے سب سے بااثر شخص چودھری منصور چاند کی حویلی کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

چودھری منصور چاند ساٹھ کے پیٹے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم چلچلاتی دھوپ میں سفر طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔ ٹھنڈی ٹھار لسی سے ہماری آؤ بھگت کی گئی' پھر چودھری منصور نے ہماری آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔ میں نے غیر قانونی سامان کی نقل و حمل کا ذکر گول کرتے ہوئے اپنی گفتگو رانی کے اغوا تک محدود رکھی۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے میری بات سنی' پھر اپنے دو خاص بندوں' اقبال اور نصیر کو بلایا اور رانی والے معاملے کے سلسلے میں ان سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ ان بندوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

چودھری منصور چاند نے کہا۔ ''یہ اقبال اور نصیر کسی عقاب سے بھی زیادہ تیز نگاہ رکھتے

ہیں۔ چاند نگر میں ہونے والی ہر کارروائی کی انہیں بخوبی خبر ہوتی ہے...... اگر کسی لڑکی کو اغوا کر کے اس طرف لایا گیا ہوتا تو اس کی اطلاع انہیں ضرور ہوتی۔''

''اور چاند نگر سے باہر کے بارے میں ان کی معلومات کیا کہتی ہیں؟'' میں نے باری باری اقبال اور نصیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چودھری سے سوال کیا۔

''خبر تو ہر طرف کی رکھتے ہیں ملک صاحب۔'' چودھری نے فخریہ لہجے میں جواب دیا' پھر سوالیہ نظر سے اپنے بندوں کو تکنے لگا۔

اقبال نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تک تو ہمارے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے جناب۔ اب رات ہونے والی ہے۔ آپ ہمیں ایک دن کی مہلت دے دیں۔ کل تک ہم آپ کو ساری رپورٹ پیش کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے' میں تمہیں کل شام تک کا وقت دیتا ہوں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ لڑکی کے اغوا کے سلسلے میں جو بھی تحقیق کرو' اس کی رپورٹ تھانے آ کر مجھے دینا ہوگی۔''

''بالکل دیں گے جی...... آپ بے فکر ہو جائیں۔'' اقبال نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نے اضافہ کیا۔ ''لڑکی کے اغوا کے علاوہ بھی ایک معاملے کے سلسلے میں مجھے معلومات چاہئیں۔ ذرا اس کا بھی خیال رکھنا ہے۔''

''کون سا معاملہ جی؟'' نصیر نے چونک کر پوچھا۔

چودھری بولا۔ ''ملک صاحب! کیا کوئی اور بھی مسئلہ ہے......؟''

''جی چودھری صاحب!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ چند جرائم پیشہ لوگ اس راستے سے غیر قانونی سامان لے کر سعید آباد کے راستے آگے کہیں پہنچاتے ہیں۔ ان کے سرغنہ کا نام گلاب خان ہے۔''

''کس قسم کا غیر قانونی سامان؟'' چودھری کے استفسار میں تشویش تھی۔

''اسلحہ اور منشیات وغیرہ......!'' میں نے بتایا۔

''اوہ......!'' چودھری گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے' ہمارے گاؤں کے آس پاس سے تو اس قسم کا کوئی غیر قانونی کام نہیں ہو رہا جی۔ اس بات کی تو میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں۔''

اقبال اور نصیر بھی بیک زبان ہو کر بولے۔ ''نہیں جناب...... ایسا کوئی کام ہمارے روٹ پر نہیں ہو رہا۔ ویسے ہم اس بارے میں معلومات اکٹھی کر کے آپ تک پہنچائیں گے......''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والی نظر سے باری باری ان دونوں کی جانب دیکھا۔ ''اور اس معاملے کو نہایت ہی خفیہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہئے......''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں تھانیدار صاحب!'' اقبال نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہم ہاتھ پاؤں بچا کر یہ کام کریں گے۔''

چودھری گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا' میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! چاند نگر سے آگے دس میل کے فاصلے پر جمال پور واقع ہے اور سعید آباد سے آگے چھ میل کے فاصلے پر نور محل نامی گاؤں ہے۔ اگر آپ کی بات کو میں درست مان لوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گلاب خان کا گروہ جمال پور سے نور محل کی طرف سفر کرتا ہے اور راستے میں ہمارا گاؤں چاند نگر اور سعید آباد آتے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''نہیں چودھری صاحب...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''جلد از جلد اس معاملے کی حقیقت کھل کر سامنے آنا چاہئے۔ کمال ہے......!'' وہ عجیب سے انداز میں متوقف ہوا' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہاں اتنا کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں کچھ خبر ہی نہیں......!''

ہم مزید تھوڑی دیر تک چودھری منصور چاند کے پاس بیٹھے' پھر واپسی کیلئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

جب ہم سعید آباد سے چاند نگر کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں ہم نے کسی آستانے کا بورڈ لگا دیکھا تھا۔ اس بورڈ پر لکھا تھا۔ ''آستانہ جھنڈے شاہ'' اس کے نیچے تیر کا نشان دے کر دو میل لکھا ہوا تھا۔ تیر کا نشان اس رستے سے جنوب کی جانب اشارہ کرتا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہاں سے دو میل جنوب میں ''جھنڈے شاہ'' کا آستانہ واقع تھا' ایک لکیر نما راستہ بھی آستانے کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔

اس بورڈ کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ یہاں سے سعید آباد پانچ میل اور چاند نگر چار

ساڑھے چار میل پر تھا۔ یہ جگہ ان دونوں گاؤں کے تقریباً درمیان میں واقع تھی۔ میں نے راستے کے کنارے نصب بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں' ادھر سے گزر رہے ہیں تو ذرا اس آستانے کو بھی چیک کر لیں...... تمہارا کیا خیال ہے؟''

''اچھا سیال ہے جی......'' اللہ بخش آستانے والے پتلے سے راستے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو پھر چلیں......؟'' میں نے پوچھا۔

''جی...... چلیں......!'' اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

ہم دونوں نے اپنے گھوڑے پتلے سے' تاریک راستے پر ڈال دیئے' پھر کچھ ہی دیر کے بعد ہم آستانے پر پہنچ گئے۔

درحقیقت وہ کوئی آستانہ نہیں بلکہ پیر جھنڈے شاہ کا مزار تھا۔ چار دیواری کے اندر آستانے یا مزار کی دیکھ بھال کرنے والے مجاور کا کمرہ بنا ہوا تھا۔ مجاور کا نام سکندر معلوم ہوا۔ سکندر ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گیا اور صحن میں ایک چارپائی پر لے جا کر بٹھایا۔

ہمارے آنے سے پہلے وہ کھانا وغیرہ پکانے میں مصروف تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چولہے پر ہانڈی نما کوئی برتن چڑھا ہوا تھا۔ چولہے میں آگ نیم روشن تھی اور دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔

میں چونکہ وردی میں ملبوس تھا لہٰذا مجھے دیکھ کر وہ خاصا الرٹ ہو گیا تھا۔ میں نے مجاور سکندر سے سوال کیا۔

''تمہارے علاوہ یہاں اور کون رہتا ہے......؟''

''کوئی نہیں جی...... بس' میں ہی رہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آج دن میں کتنے عقیدت مند جھنڈے شاہ کے مزار پر حاضری دے چکے ہیں؟'' میں نے مجاور سکندر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''دو عورتیں اور...... ایک مرد آیا تھا۔''

''کس وقت؟''

''دوپہر سے پہلے جی......!''

''ان کی عمریں کیا تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

"مرد تو جی بالکل بڈھا بابا تھا......" مجاور سکندر نے بتایا۔ "اور دونوں عورتیں بھی اچھی خاصی عمر کی تھیں۔ وہ بوڑھی تو نہیں تھیں البتہ انہیں ادھیڑ عمر کہہ سکتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے' ان میں کوئی بھی جوان نہیں تھی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اٹھارہ' بیس یا بائیس سال کی لڑکی......؟"

"نہیں جناب' بالکل نہیں!" اس نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی' پھر پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے تھانیدار صاحب......؟"

"بات بڑی خطرناک ہے سکندر بادشاہ!" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج صبح پرانا سعید آباد سے ایک لڑکی کو تین غنڈوں نے اغوا کرلیا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے' وہ جھنڈے شاہ کے آستانے کی طرف آئے تھے اسی لئے میں لڑکی کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلا ہوں......"

میں نے آخری جملوں میں تھوڑی دروغ گوئی سے کام لیا تھا تاکہ مجاور کا ردعمل سامنے آسکے۔ وہ جلدی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب...... آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔ اگر اس نوجوان لڑکی کو آستانے پر لایا جاتا تو مجھ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔"

"چلو...... آستانے پر نہیں لایا ہوگا۔" میں نے بات کو تھوڑا موڑ دیا۔ "باہر باہر سے گزر گئے ہوں گے......؟"

"اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں جناب......" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"یہ تو بتا سکتے ہو' پچھلے آٹھ دس دن میں تم نے تین اجنبی افراد کو گھوڑوں پر ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا ہو۔" میں نے کہا۔ "جو شکل وصورت سے بدمعاش اور غنڈے نظر آتے ہوں؟"

"نہیں جی...... کوئی اجنبی نظر نہیں آیا مجھے......! اس نے جواب دیا۔

"یہ راستہ آگے کس طرف جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سیدھا مین روڈ کی طرف جاتا ہے جناب......!" مجاور سکندر نے بتایا۔ "یہاں سے وہ سڑک زیادہ سے زیادہ تین میل دور ہوگی۔"

میں نے سوال کیا۔ "اگر یہاں سے مین روڈ کی طرف جائیں تو راستے میں کیا کیا آئے گا؟"

"کچھ بھی نہیں......" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا "صرف کھیت ہی کھیت نظر آئیں گے آپ کو......"

میں مزید پندرہ بیس منٹ تک گھما پھرا کر مجاور سکندر سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر آخر میں کہا۔

"سکندر بادشاہ! کسی کو پتا نہیں چلنا چاہئے کہ پولیس جھنڈے شاہ کے مزار پر پوچھ گچھ کیلئے آئی تھی۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جناب! میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔"

"سمجھ دار تو تم شکل ہی سے لگتے ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا اپنے دھیان کو بھی بیدار رکھنا۔ اگر تمہیں اس آستانے پر یا اس کے آس پاس کوئی اجنبی اور مشکوک شخص نظر آئے تو اس پر گہری نظر رکھنا اور فوراً مجھے اس کی اطلاع دینا۔"

"ٹھیک ہے جناب...... آپ جیسا کہہ رہے ہیں' میں ویسا ہی کروں گا۔" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے اسے چند ضروری ہدایات دیں اور اللہ بخش کے ساتھ آستانے سے نکل آیا۔ اس وقت تک تاریکی نے ماحول کو پوری طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ جب ہم پرانا سعید آباد پہنچے تو عشاء کی اذانیں ہورہی تھیں۔ اللہ بخش نے مجھ سے پوچھا۔

"ملک صاحب! آپ مجھے اپنے ساتھ تھانے لے کر جائیں گے یا میں......؟"

"تمہیں تھانے جانے کی ضرورت نہیں ہے اللہ بخش!" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "تم یہاں سے سیدھے اپنے گھر جاؤ اور میں جاتا ہوں تھانے کی طرف۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں شبنم کی وجہ سے پریشان ہورہا تھا۔ وہ اتنی دیر تک کبھی گھر میں اکیلی نہیں رہی......"

"مجھے بھی اس بات کا احساس ہے اللہ بخش!" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "تم بے فکر ہوکر گھر جاؤ۔ دوبارہ جب بھی مجھے تمہاری ضرورت پیش آئے گی' میں تمہیں بلالوں گا۔"

"میں ہر وقت آپ کی خدمت کیلئے حاضر ہوں جناب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"آپ کو جب بھی میری ضرورت پڑے' میں سارے کام چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے اللہ بخش کو پرانا سعید آباد والی نہر کی پلیا پر چھوڑا اور اپنے گھوڑے کو نیا سعید آباد والے راستے پر ڈال دیا۔ نیا سعید آباد...... جہاں میرا تھانہ تھا......



آئندہ روز دوپہر تک رانی کی گمشدگی یا گلاب خان کے حوالے سے مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں مسلسل اس حوالے سے سوچ بچار میں مصروف تھا کہ گلاب خان رانی کو اغوا کر کے کہاں لے گیا ہوگا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ مجھے سادہ لباس پولیس اہلکاروں کی دو تین ٹیمیں ترتیب دے کر گردونواح کے علاقوں میں پھیلا دینا چاہئے تا کہ گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کے سلسلے میں کوئی سراغ لگایا جا سکے۔

میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری کر رہا تھا کہ سہ پہر کے وقت مجاور سکندر مجھ سے ملنے تھانے پہنچ گیا۔ گزشتہ رات جھنڈے شاہ کے آستانے پر میں سکندر کو مختلف نوعیت کی ہدایات دے آیا تھا۔ اس وقت اس کی آمد خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے فوراً سے پیشتر اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

مجاور سکندر کی عمر چالیس اور پینتالیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وضع قطع اور حلیے سے وہ ایسا ہی دکھائی دیتا تھا جیسا کسی مزار کے مجاور کو نظر آنا چاہئے تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ چکا تو میں نے سوال کیا۔

''سکندر بادشاہ! سب خیریت تو ہے نا...... تمہارے چہرے پر مجھے خاصی سنسنی نظر آ رہی ہے؟''

''خیریت نہیں ہے تھانیدار جی......!'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ادھر کھیتوں میں ایک جوان لڑکی کی لاش ملی ہے......''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ''کدھر...... کن کھیتوں میں؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تم کس جوان لڑکی کی بات کر رہے ہو......؟''

وہ میرے پے در پے سوالات سے گھبرا گیا۔ ''لڑکی کون ہے' یہ تو میں نہیں جانتا جناب......'' اس نے بتایا۔ ''ہو سکتا ہے' یہ وہی لڑکی ہو جس کی تلاش میں کل رات آپ آستانے پر آئے تھے...... آستانے سے کوئی آدھا میل دور' کھیتوں کے اندر اس کی لاش پڑی ملی ہے۔''

''کیا لاش تم نے دریافت کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''لاش کے بارے میں مجھے رفاقت اور رشیدہ نے بتایا تھا۔''

''یہ رفاقت اور رشیدہ کون ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میاں بیوی ہیں جناب۔'' مجاور سکندر نے جواب دیا۔ ''یہ لوگ آستانے سے اوپر کی طرف ایک چھوٹے سے گاؤں نذیر کوٹ میں رہتے ہیں جی۔ ان کی شادی کو دس سال ہو گئے ہیں لیکن بے چاروں کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں۔ وہ جھنڈے شاہ کے مزار پر دعا وغیرہ کیلئے آتے رہتے ہیں......''

سکندر نے موضع نذیر کوٹ کی لوکیشن بتاتے وقت ''اوپر کی طرف'' کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ جب میں نے اس کی وضاحت مانگی تو اس نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق' نذیر کوٹ' جھنڈے شاہ کے مزار سے شمال مشرق میں کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ کھیتوں کے اندر آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔

''کیا تم نے رفاقت اور رشیدہ کی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا یا جا کر لڑکی کی لاش کو دیکھا بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے ان کے ساتھ جا کر خود اپنی آنکھوں سے لڑکی کی لاش کو دیکھا ہے سرکار۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اس بدنصیب کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نظر نہیں آتی اسی لئے تو مجھے شک ہوا کہ کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جس کے اغوا کے بارے میں رات آپ نے مجھے بتایا تھا......'' وہ لمحے بھر کیلئے متوقف ہوا' پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کی طرف آنے سے پہلے میں نے ایک کام اور بھی کیا ہے!''

''کیسا کام سکندر بادشاہ؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے رفاقت اور رشیدہ کو واپس نہیں جانے دیا۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''وہ ادھر آستانے پر ہی بیٹھے ہیں جب تک میں نہیں جاؤں گا' وہ آستانے سے ہلیں گے بھی نہیں۔''

''یہ واقعی تم نے بڑا لاجواب کام کیا ہے سکندر بادشاہ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم یہاں تک کیسے آئے ہو؟''

''گھوڑے پر جی۔'' اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' تم دس منٹ رکو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں......''

آئندہ دس منٹ میں' میں نے مبینہ جائے وقوعہ تک رسائی کیلئے ضروری بندوبست کیا' پھر مجاور سکندر کی رہنمائی میں روانہ ہوگیا۔ میں نے سردست رانی کے گھر والوں کو اس نئی اطلاع کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا' البتہ اللہ بخش کو میں اپنے ساتھ لے جانا نہیں بھولا تھا۔ وہ کام کا آدمی تھا اور رانی کی شناخت کے سلسلے میں بھی اس سے مدد لی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ کانسٹیبل صفدر کو بھی میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ ہمارے پاس ایک تانگا اور دو گھوڑے تھے۔ مجاور سکندر کا گھوڑا اس کے علاوہ تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ تانگے کو کوچوان سمیت اسی کچی راہ گزر پر چھوڑ دیا گیا تھا جہاں پیر جھنڈے شاہ کے آستانے سے متعلق بورڈ نصب تھا۔ اس سڑک سے آستانے تک کا راستہ اتنا تنگ تھا کہ اس پر تانگا نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔

میں اللہ بخش' صفدر' سکندر اور رفاقت و رشیدہ کے ہمراہ اس جگہ پر پہنچا جہاں کسی نوجوان لڑکی کی لاش دیکھی گئی تھی۔ یہ مقام کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک پگڈنڈی کے کنارے واقع تھا۔ آستانے سے اس مقام کا فاصلہ بمشکل آدھا میل رہا ہوگا۔

مذکورہ لڑکی کی لاش پر نگاہ پڑتے ہی اللہ بخش چلا اٹھا۔ ''یہ...... یہ تو رانی ہے......شوکت علی کی بیٹی رانی......!''

میں لاش کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ رانی اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی اور مجھے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہ لگی کہ اسے موت کی آغوش میں پناہ حاصل کئے کافی وقت گزر گیا تھا......کم ازکم پندرہ بیس گھنٹے!

میں نے الٹ پلٹ کر رانی کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا تو پتا چلا کہ اس کی موت سر میں لگنے والی خطرناک چوٹ کے سبب واقع ہوئی ہوگی۔ سر کے عقبی حصے میں اس کی کھوپڑی ایک مقام سے چٹخ گئی تھی۔ یا تو سر کے اس حصے پر کسی وزنی شے سے وار کیا گیا تھا یا پھر اس کا سر بڑے طوفانی انداز میں کسی ٹھوس شے کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ قصہ مختصر' رانی کا شمار اب زندہ افراد میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے نگاہ گھما کر چاروں جانب دیکھا۔ ہر طرف سرسبز لہلہاتے کھیت نظر آرہے تھے۔ رانی کو اغوا کرنے والوں نے رات کے کسی حصے میں اسے یہاں پھینکا تھا۔ وہ خود کہاں

تھے' اس بارے میں فی الحال اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ گلاب خان کے خیال کو پس پشت ڈال کر میں رانی کی لاش کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''تھانیدار صاحب!'' رفاقت نے ملتجی لہجے میں مجھے پکارا۔ ''اگر آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندھیرا ہونے لگے گا۔ ہمیں ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرکے اپنے گھر بھی پہنچنا ہے......''

رفاقت کی مجبوری میں مجھے کوئی بہانہ نظر نہ آیا۔ میں نے اس سے اور اس کی بیوی سے رسمی پوچھ گچھ کی اور انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ وہ رانی کی موت کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان کی باتوں اور انداز سے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے تھے۔ لہٰذا انہیں خوامخواہ جائے وقوعہ پر روکے رکھنا زیادتی والی بات ہوتی۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد میں نے سکندر کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''سکندر بابا! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو......رانی کی لاش کو کس نے یہاں پھینکا ہوگا؟''

''جناب...... میں کیا بتاؤں۔'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں جی......!''

''جائے وقوعہ کے نزدیک ترین کوئی جگہ' پیر جھنڈے شاہ کا آستانہ ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس آستانے کے تم مجاور ہو۔ تمہارے سوا اس آستانے پر کوئی اور بندہ بشر نہیں رہتا' لہٰذا سب سے پہلے تو میں تمہی سے پوچھ گچھ کروں گا نا......؟''

''جناب......کیا آپ...... مجھ پر لڑکی کے قتل کا شک کررہے ہیں......'' وہ خوفزدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھ سے' بڑی سے بڑی قسم لے لیں...... مجھے اس معاملے کی کچھ خبر نہیں ہے......''

''میں نے نہ تو تم پر رانی کے قتل کا الزام عائد کیا ہے اور نہ ہی کسی طرح کی قسم اٹھانے کی بات کی ہے......!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک قتل ہوا ہے......مقتول کی لاش تمہارے آستانے سے آدھے میل کے فاصلے پر پائی گئی ہے۔ آستانہ' جائے وقوعہ سے قریب ترین جگہ ہے لہٰذا تم سے پوچھ گچھ اور کڑی تفتیش کا تو حق بنتا ہے سکندر بادشاہ......!''

''جی...... جی......!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ ضرور تفتیش کریں...... مجھ سے جو بھی پوچھنا چاہیں' وہ پوچھیں...... میں آپ کی ہر خدمت کیلئے حاضر ہوں جناب۔''

میں نے مختلف زاویوں سے گھما پھرا کر مجاور سکندر سے کوئی درجن بھر سوال کئے لیکن اس کے جوابات میں مجھے کام کی ایک بات بھی نہ مل سکی۔ بالآخر ہم لوگوں نے جلدی جلدی جائے وقوعہ کی ضروری کارروائی کو نمٹایا اور رانی کی لاش کو ایک گھوڑے کی پشت پر لاد کر ہم آستانے کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب ہم آستانے پر پہنچے تو شام کا سماں تھا۔ دھوپ رخصت ہو رہی تھی لیکن ابھی تک فضا حدت سے دہکی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ہوا نام کو نہیں تھی۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ دم گھٹ کی سی کیفیت طاری تھی۔

آستانے کے دروازے نما گیٹ پر پہنچے تو میں نے مجاور سکندر سے کہا۔ ''میرا یہ آدمی......'' میں نے کانسٹیبل صفدر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''کچھ عرصے کیلئے اس آستانے پر قیام کرے گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

جائے وقوعہ سے آستانے کی طرف آتے ہوئے میں نے صفدر سے تفصیلی بات کر لی تھی اور اسے سمجھا دیا تھا کہ وہاں رک کر اسے کن چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ وہ میرے مقصد کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

''نہیں جناب...... مجھے کوئی اعتراض نہیں' مجاور سکندر نے باری باری مجھے اور کانسٹیبل صفدر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے سپاہی جی جب تک چاہیں آستانے پر رہ سکتے ہیں۔''

میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''صفدر! میں لاش کو لے کر جا رہا ہوں۔ تم ادھر ہی رکو گے......''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ بڑی سعادت مندی سے بولا۔ ''جو آپ کا حکم......!''

میں کانسٹیبل صفدر کو پیر جھنڈے شاہ کے آستانے پر چھوڑ کر اللہ بخش کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ ہم نے رانی کی لاش کو تانگے میں ڈالا اور تھانے کی جانب روانہ ہو گئے۔

کانسٹیبل صفدر کو میں نے ایک خاص مقصد کیلئے آستانے پر چھوڑا تھا۔ میں اپنے ایک شک کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پٹرول

سے چلتی ہے۔ اگرچہ میں نے مجاور سکندر کو اچھی طرح ٹٹول کر اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ وہ رانی کے قتل میں کسی بھی طور ملوث نہیں تھا لیکن وہی شک والی بات کہ...... ہو سکتا ہے' گلاب خان نے پچھلی رات اسی آستانے پر گزاری ہو اور ڈرا دھمکا کر سکندر کو زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا ہو۔ بہرحال' حقیقت جو بھی تھی وہ زیادہ عرصے تک مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

ہم پرانا سعید آباد پہنچے تو اللہ بخش نے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! اگر کوئی حرج نہ ہو تو شوکت علی کو اس اندوہناک واقعہ کے بارے میں بتا دیں؟''

''حرج تو کوئی نہیں ہے اللہ بخش!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن رانی کی لاش فی الحال اس کے ورثاء کے حوالے نہیں کی جا سکتی۔ پہلے لاش کو پوسٹمارٹم کیلئے ہسپتال بھجوانا ہوگا......!''

''ٹھیک ہے جناب! آپ قانونی تقاضے ضرور پورے کریں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں' شوکت کو پتا چل جائے کہ اس کی بیٹی کے ساتھ آخر کیا ہوا ہے۔''

''چلیں...... اتنا تو کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا پھر کوچوان کو ہدایت کی۔ ''شوکت علی کے گھر کی طرف چلو بھئی......!''



جوان اولاد کی موت کا غم کتنا ظالم اور رلا دینے والا ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانے کیلئے کسی سپیشل قسم کی عقل و دانش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس دکھ اور اذیت کو بخوبی سمجھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے......شوکت علی کا گھر دیکھتے ہی دیکھتے ماتم کدہ بن گیا تھا۔

میں نے پچھلی رات ہی رانی کی لاش کو پوسٹمارٹم کیلئے سرکاری ہسپتال بھجوا دیا تھا۔ ایک بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ مقتول رانی کے ساتھ کسی قسم کا غیر اخلاقی سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ اگر وہ ایسے کسی ناخوشگوار تجربے سے گزری ہوتی تو میری عقابی نگاہ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے رانی کی لاش کا بغور معائنہ کرتے وقت اس نکتے کو ذہن میں رکھا تھا۔ عموماً دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جب کسی لڑکی یا عورت کو اس طرح اغوا کیا جاتا ہے تو اس کے پیچھے اغوا کنندگان کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مغوی کی عزت کا جنازہ نکالا جائے' لیکن رانی کے ساتھ ایسا کچھ بھی پیش نہیں آیا تھا۔ اس بات نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا دیا تھا۔

ابھی تک جو معلومات حاصل تھیں ان کی روشنی میں رانی اور گلاب خان اینڈ کمپنی میں کسی دشمنی کا سراغ نہیں ملتا تھا' لہٰذا بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ محض اپنی عیاشی کے خیال سے رانی کو اٹھا لے گئے تھے لیکن اس نوعیت کی کسی بے ہودگی کے آثار بھی نہیں ملے تھے اور رانی کی جان بھی چلی گئی تھی۔ یہاں سوال یہ اٹھتا تھا کہ رانی کی موت کا سبب یا اس کے قتل کا مقصد کیا تھا......؟

اگر میں اس ایک سوال کا جواب تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو باقی کے تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے۔

دوپہر سے پہلے میں نے حسب پروگرام' دو دو اہلکاروں پر مشتمل تین ٹیمیں تشکیل دیں

اور انہیں خصوصی ہدایت کے ساتھ اردگرد کے علاقوں میں پھیلا دیا۔ مجھے قوی امید تھی کہ بہت جلد ان لوگوں کی جانب سے کوئی سودمند خبر سننے کو ملے گی۔

وہ ایک اداس اور تڑپا دینے والا دن تھا۔ گزشتہ رات پرانا سعید آباد میں یہ خبر عام ہوگئی تھی کہ رانی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ رانی کے باپ شوکت علی نے اپنی مردہ بیٹی کی جھلک پچھلی رات ہی دیکھ لی تھی اور آج صبح ہی صبح وہ تھانے پہنچ گیا تھا۔ اس کے لبوں پر متعدد سوالات تھے۔ گزشتہ رات کی طرح اس وقت بھی میں نے اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

''شوکت علی! میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں تمہاری بیٹی کو تو واپس نہیں لا سکتا البتہ یہ تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں رانی کی موت کے ذمہ داروں کو بہت جلد گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔''

''جناب......!'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''میری تو ایک ہی بیٹی تھی۔ جب رانی نہیں رہی تو ہمارے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اب اس کے قاتلوں کو سزا ملے یا جزا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''بہت فرق پڑتا ہے شوکت علی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ایک سنگین اور سفاک حقیقت ہے کہ رانی کو زندگی کی طرف واپس نہیں لایا جا سکتا لیکن اس کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوا کر بہت سی' رانی جیسی معصوم لڑکیوں کی زندگیوں اور عزتوں کی حفاظت تو کی جا سکتی ہے۔ گلاب خان جیسے جرائم پیشہ لوگ معاشرے کیلئے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ناسوروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''شاید نہیں' میں یقیناً ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''ایک بات تو بتائیں تھانیدار صاحب......؟'' وہ زخمی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''ہاں پوچھو......کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''میری رانی نے کسی گلاب خان کا کیا بگاڑا تھا جو اس کی زندگی چھین لی گئی؟'' اس کے سوال میں بڑا درد تھا۔ ''ہم نے تو کبھی اس منحوس کا نام تک نہیں سنا تھا۔''

''شوکت علی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب انسان کا نصیب

ساتھ نہ دے رہا ہوتا تو ہر سیدھا قدم الٹا ہو جاتا ہے۔ جو کچھ بھی پیش آیا' اس میں نہ تو رانی کا کوئی قصور تھا اور نہ ہی اسے کسی دشمنی کا شاخسانہ کہا جا سکتا ہے...... بس' یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔''

وہ گلوگیر آواز میں پوچھ بیٹھا۔ ''رانی کی لاش ہسپتال سے کب تک آ جائے گی۔ ہمیں اس کے کفن دفن کا بھی بندوبست کرنا ہے۔''

شوکت علی کے سوال کے جواب میں' میں نے بتایا۔ ''مجھے امید ہے' رانی کی لاش کل صبح ہسپتال سے آ جائے گی یا زیادہ سے زیادہ شام تک......''

وہ مزید تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا' پھر مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

دوپہر کے بعد میں تھانے ہی میں بیٹھا ہوا تھا کہ کانسٹیبل صفدر آ گیا۔ صفدر کو گزشتہ رات میں پیر جھنڈے شاہ کے آستانے پر چھوڑ آیا تھا۔ اس کا چہرہ خاصا تمتمایا ہوا لگ رہا تھا۔ میں نے اسے فوراً اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے صفدر...... لگتا ہے' تم نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا ہے؟''

''پتا نہیں جناب...... یہ کارنامہ ہے یا کچھ اور......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''لیکن آج صبح میں نے جو کچھ دیکھا ہے' وہ ضرور آپ کیلئے دلچسپی کا باعث ہو گا۔''

''تم نے آج صبح ایسا کیا دیکھ لیا ہے صفدر!'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''مجھے بھی تو پتا چلے آخر......؟''

''جناب! آپ رات کو مجھے پیر جھنڈے شاہ کے مزار پر چھوڑ آئے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''رات گئے تک میں مجاور سکندر سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے گھما پھرا کر ہر زاویے سے اسے گھسنے کی کوشش کی لیکن ہمارے مطلب کی کوئی بات سامنے نہ آ سکی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ تو مجاور رانی کے اغوا یا اس کی موت سے واقفیت رکھتا ہے اور نہ ہی اسے گلاب خان اینڈ کمپنی کی کوئی خبر ہے' ہم مجاور سکندر کو مشکوک افراد کی فہرست میں شامل نہیں کر سکتے......''

''یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' وہ سانس لینے کیلئے تھما تو میں نے سوال کیا ''تم نے آج صبح کیا دیکھا ہے' مجھے اس کے بارے میں بتاؤ؟''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آج صبح میں رفع حاجت کیلئے کھیتوں کی طرف گیا تو میرا جی چاہا کہ تھوڑی سیر کر لوں' تو جناب...... میں ٹہلتا ہوا اس طرف جا نکلا جہاں رانی کی لاش پڑی ملی تھی۔ میں چند لمحات تک وہاں رکا' پھر آگے بڑھتا چلا گیا۔ پھر......!''

''آگے کس طرف؟'' میں نے چونک کر قطع کلامی کی۔ ''کیا تم نے نذیر کوٹ کی جانب رخ کیا تھا؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نذیر کوٹ تو وہاں سے شمال مشرق کی طرف پڑتا ہے۔ میں سیدھا مشرق کی سمت بڑھتا چلا گیا تھا۔ کوئی آدھا میل آگے جانے کے بعد میں ٹھٹک کر رک گیا اور میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے مجھے فی الفور آپ کے پاس آنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''بجھارتیں نہیں ڈالو صفدر علی!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''فوراً مجھے اس منظر کی تفصیل سے آگاہ کرو جس نے تمہیں بے چین کر کے میرے پاس پہنچا دیا ہے......؟''

''ملک صاحب! میں نے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک ڈیرا دیکھا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''اس ڈیرے نے مجھے چونکا دیا اسی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں ڈیرے تک جا پہنچا لیکن اس کے اندر داخل ہونے کا مجھے موقع نہ مل سکا کیونکہ ڈیرے کے گیٹ پر ایک تالا جھول رہا تھا۔ میں نے ڈیرے کے چاروں طرف ایک چکر لگایا اور سن گن لینے کی کوشش کی لیکن ڈیرے کے اندر مجھے زندگی کے آثار محسوس نہیں ہوئے......''

''پھر تم نے کیا کیا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''میں سیدھا جھنڈے شاہ کے آستانے پر پہنچا۔ وہاں ناشتہ کیا اور پھر آپ کی طرف آ گیا ہوں۔'' صفدر نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے مجاور سکندر سے اس ڈیرے کا تذکرہ کیا ہے؟''

''نہیں جناب! میں نے اس سلسلے میں سکندر سے کوئی بات نہیں کی۔''

''یہ تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ اس ڈیرے کا معائنہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔'' صفدر نے میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں' یہ تو بہت ضروری ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم

ابھی اس طرف روانہ ہو رہے ہیں۔''

کانسٹیبل صفدر اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔



دوپہر کو ڈھلے کافی دیر ہو گئی تھی تاہم دھوپ کی تمازت اور فضا کی حدت میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اساڑھ (ہاڑ) کا مہینہ ایسا ہی ظالم اور سفاک ہوتا ہے۔ یہ اپنی شدت سے ایک طرف کھڑی فصل کو پکاتا ہے تو دوسری جانب مخلوق خدا کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دیتا ہے۔ بہرحال' تمام موسم اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اور اللہ کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی حکمت چھپی ہوتی ہے۔

میں صفدر کی رہنمائی میں مذکورہ ڈیرے پر پہنچ گیا۔ آستانے سے ہم نے مجاور سکندر کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ صفدر کا کہنا بالکل درست تھا کہ ڈیرے پر تالا لگا ہوا تھا اور اندر کسی ذی روح کے آثار محسوس نہیں ہوتے تھے۔ میں نے اس ڈیرے کے گردونواح کا بغور جائزہ لیا۔

نزدیک یا دور مجھے کوئی گاؤں دیہات نظر نہیں آیا۔ کھیتوں کے بیچ بنے اس ڈیرے کو دیکھ کر عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ جس مقام سے کل مجھے رانی کی لاش ملی تھی وہاں سے ایک کچا راستہ موضع نذیر کوٹ کی طرف جاتا تھا۔ یہ کچا راستہ درحقیقت نذیر کوٹ کو پیر جھنڈے شاہ کے آستانے سے ملاتا تھا جو بعدازاں پکی سڑک سے جا ملتا تھا۔ یہ وہی پکی سڑک تھی جو سعید آباد اور چاندنگر کے درمیان آمدورفت کیلئے استعمال ہوتی تھی۔

جب میں صفدر کی معیت میں اس خاموش ڈیرے کی طرف آیا تو ہمیں نذیر کوٹ کی جانب جانے والے راستے کو چھوڑنا پڑا تھا۔ یہ ڈیرہ جائے وقوعہ سے عین مشرق میں ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ڈیرے پر کھڑے کھڑے میری نگاہ نے دو اور راستے بھی دریافت کر لئے۔ ایک راستہ ڈیرے سے شمال میں' کھیتوں کے بیچوں بیچ چلا گیا تھا۔ دوسرا راستہ ڈیرے سے جنوبی سمت میں چلا گیا تھا۔ ڈیرے سے نکلنے والے اور ڈیرے تک پہنچانے والے راستوں کو میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا اور مجاور سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سکندر بادشاہ! تمہارے خیال میں یہ ڈیرہ کس کی ملکیت ہے؟''

''جناب! میری معلومات کے مطابق یہ ڈیرہ نذیر کوٹ کے چودھری حکمت یار کا ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''لیکن پچھلے کافی عرصے سے تو یہ یونہی غیر آباد پڑا ہے۔

میں نے یہاں کسی کو رہتے نہیں دیکھا۔''

''نظر تو اب بھی یہاں کوئی نہیں آ رہا......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میری چھٹی حس بار بار مجھے اطلاع دے رہی ہے کہ یہ ڈیرہ غیر آباد نہیں......''

''غیر آباد نہیں......!'' سکندر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے جی؟''

''اس کا مطلب ابھی کھل کر سامنے آ جائے گا۔'' میں نے جواب تو مجاور سکندر کو دیا تھا لیکن میری توجہ کا مرکز کانسٹیبل صفدر علی تھا۔

''ملک صاحب!'' صفدر نے فوراً میرا ذہن پڑھ لیا۔ ''ہمیں اس ڈیرے کے اندر سے جائزہ لینا چاہئے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

صفدر بولا۔ ''ملک صاحب! میرا خیال ہے' ہمیں دیوار پھلانگ کر ڈیرے کے اندر داخل ہونا چاہئے۔''

''سکندر بادشاہ! تم بھی ہمارے ساتھ ڈیرے کے اندر جاؤ گے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اس امر کے گواہ رہو گے کہ میں محض خانہ تلاشی کیلئے ڈیرے میں داخل ہوا تھا اور یہ تلاشی میں نے تمہاری آنکھوں کے سامنے لی ہے...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی......!'' اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ''بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں تھانیدار صاحب!''

''ہوں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی' پھر کانسٹیبل صفدر کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تو پھر...... بسم اللہ کریں!''

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم ڈیرے کے اندر تھے۔

وہ عام ڈیروں ہی جیسا ایک ڈیرہ تھا۔ وسیع و عریض صحن اور عقبی حصے میں دو تین کمرے بنے ہوئے' لیکن وہاں کوئی بندہ بشر نظر آتا تھا اور نہ ہی مال مویشی۔ صحن میں مختلف اقسام کے چار پانچ درخت بھی ایستادہ دکھائی دیتے تھے۔ میں نے اندر پہنچتے ہی ایک دیوار کے ساتھ بنی کھرلیوں (کنڈیوں) کا رخ کیا۔ یہ میرا ایک غیر ارادی عمل تھا۔ میرے اندر سے ایک آواز اٹھی تھی کہ مجھے اس طرف جانا چاہئے اور یہ آواز بے سبب نہیں تھی۔

ایک دو کھرلیوں میں تازہ چارا دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ جب ڈیرے پر کوئی مال مویشی

یا جانور نظر نہیں آ رہا تھا تو پھر کھرلیوں میں تازہ چارے کی موجودگی کیا معنی رکھتی تھی۔ کھرلیوں سے پلٹ کر میں کچے صحن کی زمین کا بغور جائزہ لینے لگا۔

جلد ہی میں نے تین چار گھوڑوں کے پاؤں کے نشانات کو ڈھونڈ نکالا' گویا وہاں تین' چار گھوڑے ادھر ادھر چلتے پھرتے رہے تھے اور کھرلیوں میں موجود چارا بھی انہی گھوڑوں سے تعلق رکھتا تھا۔ میری چھٹی حس چیخ چیخ کر پکارنے لگی کہ گلاب خان اور اس کے ساتھیوں نے اس ڈیرے پر قیام کیا تھا اور...... وہ لوگ رانی کو اغوا کر کے بھی اسی ڈیرے پر لائے تھے۔

اس خیال کے ساتھ ہی میں ڈیرے کے عقبی حصے میں بنے کمروں کی جانب بڑھ گیا۔ مذکورہ کمروں کے دروازے بند تھے اور ان کمروں میں داخل ہونے سے پہلے ہی مجھے وہاں کسی کے قیام کے مزید آثار بھی مل گئے۔

کمروں سے متصل دیوار کے ساتھ دو تین چولہے بنے ہوئے تھے۔ چولہوں کی کیفیت اور وہاں پڑے چند برتنوں کی حالت سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ چولہے کچھ دیر پہلے زیر استعمال رہے تھے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہاں کچھ لوگ ٹھہرے تھے۔

ہم نے تھوڑی سی کوشش کر کے بند کمروں کو کھول لیا۔ ایک کمرے میں ٹوٹا پھوٹا مختلف نوعیت کا سامان بھرا ہوا تھا۔ باقی دونوں کمروں کی حالت سے لگتا تھا' وہ ڈیرہ غیر آباد نہیں تھا۔ کمروں کے اندر چارپائیاں اور بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ کھونٹیوں پر تین چار جوڑے مردانہ بھی ٹنگے نظر آ رہے تھے۔ ان کپڑوں کی موجودگی نے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی کہ وہ ڈیرہ کسی بھی قیمت پر غیر آباد نہیں تھا۔

میں فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور گردن جھکا کر چارپائیوں کے نیچے نگاہ دوڑائی۔ ایک چارپائی کے نیچے بڑا سا چوبی صندوق رکھا نظر آیا۔ میں نے وہ صندوق کھینچ کر باہر نکال لیا۔

صندوق کو تالا بند نہیں کیا گیا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے اندر کوئی اہم یا قیمتی چیز نہیں ہو گی۔ میں نے اسی بات کی تصدیق کیلئے صندوق کھول لیا اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مذکورہ صندوق کے اندر صرف دو چیزیں رکھی دکھائی دیں۔ ایک انگوری رنگ کا دوپٹا اور دوسری زنانہ سلیپر......!

میرے تخیل نے پرواز کی اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا' جب میں نے پہلی مرتبہ رانی کی لاش کو دیکھا تھا۔ اس کے بدن پر پھول دار قمیض اور پلین شلوار تھی۔ اس لباس میں ہلکا سبز رنگ غالب نظر آتا تھا اور مردہ رانی پاؤں سے ننگی تھی۔

انگوری دوپٹے اور زنانہ سلیپر نے رانی کو پیش آنے والی صورتحال کی وضاحت کر دی تھی۔ اب اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ رانی کو اغوا کر کے اسی ڈیرے پر لایا گیا تھا اور اس کی موت بھی ادھر ہی واقع ہوئی تھی۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ گلاب خان اینڈ کمپنی نے اس ڈیرے کو اپنا اڈا بنا رکھا تھا' میرے رگ و پے میں ایک سنسنی خیز لہر سی دوڑ گئی۔ اللہ بخش کے مطابق گلاب خان کسی بڑے جرائم پیشہ شخص کا آلہ کار تھا۔ تاہم اس ڈیرے کی حالت' رانی کی موت' رانی کے اغوا اور اللہ بخش کی بیان کردہ کہانی اسی جانب واضح اشارے کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اس تمام ترکھٹ راگ میں میرے لئے اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ گلاب خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ وہاں آئے گا کیونکہ ان کے کپڑے لتے اور دوسرا سامان ابھی تک وہیں رکھا ہوا تھا۔

جب صورتحال روز روشن کی طرح واضح ہو گئی تو مجاور سکندر نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! یہ دوپٹہ اور جوتی تو اسی بدنصیب لڑکی کی لگتی ہے' کل آپ جس کی لاش یہاں سے اٹھا کر لے گئے تھے......''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے سکندر بادشاہ!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رانی کو اغوا کرنے والوں نے اس ڈیرے کو اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے' یہ تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں جبکہ...... یہاں سے تمہارا آستانہ زیادہ سے زیادہ آدھے میل کی دوری پر ہے۔''

''آپ میری بات کا یقین کریں سرکار!'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔ ''میں رانی کے اغوا' اس کی موت یا اسے اغوا کرنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ ڈیرہ تو کافی عرصے سے غیر آباد پڑا ہوا ہے اور میرا اس طرف آنا جانا بھی نہیں ہوتا۔''

''تم نے کیا بتایا تھا' یہ ڈیرہ کس کی ملکیت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

سکندر نے جواب دیا۔ ''چودھری حکمت یار کی جناب۔''

''حکمت یار موضع نذیر کوٹ کا چودھری ہے نا......؟''

"جی ہاں......!"

"؟ کیا کل سے اب تک نذیر کوٹ سے کسی نے آ کر پوچھا ہے کہ یہاں کس لڑکی کی لاش ملی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "نہیں جناب......!"

"حالانکہ ایسا ہونا چاہئے تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "رانی کی لاش کو رفاقت اور اس کی بیوی رشیدہ نے دریافت کیا تھا۔ یہ جوڑا موضع نذیر کوٹ کا رہنے والا ہے۔ انہوں نے گاؤں جا کر اس اندوہناک واقعہ کا ذکر تو کیا ہوگا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد وہاں سے کوئی ادھر کا رخ نہ کرے؟"

"مجھے خود بھی اس بات پر حیرت ہے......!" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "اب یہی ہوسکتا ہے کہ رفاقت اور رشیدہ نے گاؤں واپس جا کر اپنی زبان بند رکھی ہو......!"

"ایسا ممکن تو نظر نہیں آتا اور یہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے......!" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "بہرحال، دیکھتے ہیں، آگے کیا ہوتا ہے۔"

کانسٹیبل صفدر نے مجھ سے پوچھا۔ "ملک صاحب! اب کیا کرنا ہے؟"

"کیا کرنا ہے......!" میں نے زیر لب دہرایا، پھر سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سکندر بادشاہ! آپ تو جاؤ واپس آستانے پر۔"

"اگر میری ضرورت ہو تو میں رک جاتا ہوں......" سکندر نے کہا۔

"نہیں......!" میں نے قطعیت سے کہا۔

"ٹھیک ہے جی...... جو آپ کا حکم!"

وہ جانے کیلئے مڑا تو میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "سکندر بادشاہ! اس حوالے سے اپنی زبان بند رکھنا کہ پولیس نے یہ ڈیرہ دریافت کیا ہے......!"

"میں سمجھ گیا جناب!" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں...... میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

سکندر مجاور کے جانے کے بعد، میں نے کانسٹیبل صفدر سے کہا۔ "صفدر! میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اگر اس ڈیرے کو گلاب خان اور اس کے ساتھیوں نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے تو وہ دوبارہ ادھر ضرور آئیں گے اور وہ رات ہی میں ادھر کا رخ کریں گے۔" میں نے گہری سنجیدگی

سے کہا۔ "جب تک ہم تھانے کا ایک چکر لگا لیتے ہیں۔ وہاں کی خیر خبر رکھنا بھی ضروری ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!" وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔ "تو پھر چلیں......"

"ہاں، چلیں......!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ہم اپنے گھوڑوں کی جانب بڑھ گئے۔

ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں سے رخصت ہونے لگے تو میں نے اپنے گھوڑے کا رخ جنوبی سمت میں موڑ لیا۔ صفدر نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"ملک صاحب! یہ آپ کس طرف جا رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے......! میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "ہم تھانے جا رہے ہیں۔"

"لیکن......!" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ "ہم آئے تو ادھر سے تھے۔" اس نے پیر جھنڈے شاہ کے آستانے کی سمت اشارہ کیا۔ "اور اب آپ کسی دوسری طرف چل پڑے ہیں......!"

"یہ ضروری تو نہیں کہ ہم جس راستے سے آئے ہیں اسی سے واپس بھی جائیں۔" میں نے گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انسان کو نئی نئی راہیں دریافت کرتے رہنا چاہئے......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے، یہ راستہ مین روڈ کی طرف نکلے گا...... ادھر سے چلتے ہیں۔ مین روڈ سے سیدھے تھانے کی طرف نکل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب...... جیسا آپ کہیں۔" صفدر نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

ہم گھوڑوں کو مناسب رفتار سے دوڑاتے ہوئے اپنی منزل کی جانب چل پڑے۔ میرا اندازہ صد فیصد درست نکلا۔ ڈیرے سے نکلنے والا وہ کچا راستہ مین روڈ سے آملا تھا اور ایک محتاط حساب کے مطابق یہ فاصلہ دو میل کے لگ بھگ رہا ہوگا۔

مین روڈ پر آ کر ہم نے گھوڑوں کو مشرق کی سمت ڈال دیا۔ یہ روڈ ہمیں نیا سعید آباد تک پہنچانے کیلئے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔



جب میں تھانے پہنچا تو ایک ٹیم میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں' میں نے دو دو افراد پر مشتمل تین ٹیمیں تشکیل دے کر ادھر ادھر کے علاقے میں پھیلا دی تھیں تاکہ وہ رانی اور گلاب خان کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں۔ انہی میں سے ایک ٹیم میرا انتظار کر رہی تھی۔ مذکورہ ٹیم کانسٹیبل ارشاد اور اسلم پر مشتمل تھی۔ میں نے فوراً انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

''ہاں بھئی......'' وہ دونوں میرے سامنے آ کر بیٹھے تو میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔''لگتا ہے' کوئی سنسنی خیز رپورٹ لے کر آئے ہو؟''

''جی ملک صاحب!'' ارشاد نے اثبات میں گردن ہلائی۔''بڑی خاص رپورٹ ہے۔ ہم نے گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کا سراغ لگا لیا ہے۔''

''تفصیل کیا ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

اسلم نے بتایا۔''جناب! مین روڈ پر کوئی دو' سوا دو میل مغرب کی طرف جائیں تو وہاں سڑک کے کنارے ایک چھپر ہوٹل ہے' اس ہوٹل کے مالک رب نواز نے بتایا ہے کہ وہاں سے تین گھڑسوار اکثر گزرتے ہیں...... یہ سلسلہ پچھلے ایک ماہ سے جاری ہے......''

''تین گھڑسوار؟'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔''کیا ہوٹل والے رب نواز نے گلاب خان کا نام لے کر تمہیں یہ اطلاع دی ہے؟''

''نہیں جناب!'' ارشاد نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''رب نواز ان تین میں سے کسی شخص کے نام سے واقف نہیں۔ موجودہ حالات کی روشنی میں یہ تو ہمارا اندازہ ہے کہ وہ گلاب خان اور اس کے دو ساتھی ہو سکتے ہیں۔''

''یہ تین گھڑسوار کس طرف سے آتے ہیں اور رب نواز کے ہوٹل کے قریب سے گزر کر کدھر کو جاتے ہیں۔'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔''رب نواز نے اس بارے میں کچھ بتایا ہے......؟''

''ہم نے بہت محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے رب نواز کو کریدا ہے۔'' اسلم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔''اس کے مطابق وہ لوگ مین روڈ پر مغرب کی طرف سے آتے ہیں اور اس کے ہوٹل سے بائیں جانب ایک کچے راستے پر مڑ جاتے ہیں۔ یہ راستہ مین روڈ سے شمال میں کسی طرف جاتا ہے۔''

میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا سا ہوا۔ متروکہ ڈیرے سے واپسی کے سفر میں

جب ہم مین روڈ پر پہنچے تھے تو میں نے وہاں سڑک کے کنارے ایک چھپر ہوٹل دیکھا تھا۔ کانسٹیبل اسلم یقیناً اسی ہوٹل کا ذکر کر رہا تھا۔ ہم لوگ ڈیرے سے جنوب میں آئے تھے اور وہ گھڑسوار مین روڈ سے شمال کی جانب جاتے تھے یعنی ایک ہی بات تھی۔

''کیا تم لوگوں کی پوچھ گچھ سے ہوٹل کے مالک رب نواز کو کسی قسم کا شک تو نہیں ہوا؟'' میں نے یکے بعد دیگرے دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں جناب' بالکل نہیں......'' ارشاد بڑے اعتماد سے بولا۔''ہم نے بڑی ہوشیاری سے کام دکھایا ہے۔''

''اب تم دونوں یہاں سے سیدھے رب نواز کے ہوٹل کی طرف جاؤ گے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر تحکمانہ انداز میں کہا۔''اور نہایت ہی چابک دستی سے رب نواز کے ہوٹل پر نظر رکھو گے پھر...... جیسے ہی تمہیں وہ گھڑسوار نظر آئیں' فوراً سے پیش تر تھانے آ کر مجھے اطلاع دو گے...... تم میں سے ایک ادھر ہی ٹھہرے گا' دوسرا میرے پاس آئے گا۔ ٹھیک ہے......؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ بیک زبان ہو کر بولے۔''بالکل ٹھیک ہے......!''

اسلم اور ارشاد کو رخصت کرنے کے بعد میں صفدر کی جانب متوجہ ہو گیا۔''صفدر تم کانسٹیبل فرید کو اپنے ساتھ لے کر پیر جھنڈے شاہ کے آستانے پر چلے جاؤ۔ تم دونوں وہیں ڈیرہ جما کر بیٹھو گے اور اردگرد کے ماحول پر گہری نظر رکھو گے...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔''میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا......''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔''میں تم سے کسی ایسے ہی جواب کی توقع کر رہا تھا۔''

''ایک بات پوچھوں ملک صاحب؟'' صفدر نے کہا۔

''ہاں...... ضرور پوچھو۔''

''آپ کا اپنا کیا پروگرام ہے......؟''

''صفدر! میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''اگر گلاب خان یا اس کے ساتھیوں ہی نے

رانی کو موت سے ہمکنار کیا ہے تو پھر وہ ایک آدھ دن کیلئے ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ اس دوران میں، میں تھانے میں رہ کر چند ضروری کام نمٹا لوں گا۔"

کانسٹیبل صفدر نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

میں رات تک تھانے میں بیٹھا اسی کیس کے تانے بانے سلجھانے کی کوشش کرتا رہا، پھر اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف آ گیا۔

رات کو میں سونے کیلئے لیٹا تو بھی گلاب خان والا معاملہ میرے دماغ سے چپکا ہوا تھا۔ اب تک اس سلسلے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کی روشنی میں گلاب خان پر ہاتھ ڈالنے کیلئے متروکہ ڈیرے کی کڑی نگرانی بہت ضروری تھی، لیکن اس سے پہلے مجھے ایک اور اہم کام بھی کرنا تھا۔

میں ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد سو گیا۔



اگلی صبح میں نے اے ایس آئی جمشید خان کو خصوصی ہدایات دیں اور خود ہیڈ کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ میں نے علاقہ ایس پی سے ملاقات کی اور انہیں تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا۔ ایس پی صاحب نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر انہوں نے کہا۔

"صفدر حیات...... یہ بندہ اللہ بخش کون ہے؟"

"جناب! وہ پرانا سعید آباد میں رہتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کسی زمانے میں اللہ بخش شہر میں رہا کرتا تھا۔ اب طویل عرصے سے ادھر گاؤں میں ہے اور کھیتی باڑی کرتا ہے۔ اس کی ایک جوان بیٹی ہے...... شبنم جو متوفی رانی کی بڑی گہری دوست ہے۔"

میں نے رپورٹ پیش کرتے وقت ایس پی صاحب کو اللہ بخش اور اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا تھا۔

"اللہ بخش پر خصوصی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولے۔ "گلاب خان اور اس کے سرغنہ کے بارے میں اس کی معلومات بڑی حیرت انگیز ہیں...... ہوسکتا ہے، اللہ بخش کا کنکشن انہی لوگوں سے ہو۔"

"سر! مجھے تو ایسا محسوس نہیں ہوتا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کا حکم ہے تو میں اسے نظر میں رکھوں گا۔"

"صفدر حیات!" وہ گھمبیر انداز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ "میں نے پہلے تمہیں نہیں بتایا تھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم جس سمگلر گروہ کی تاک میں ہیں اور جن کے بارے میں تمہیں بتایا گیا تھا ان لوگوں کا تعلق اسی سرغنہ بدنام زمانہ شخص ہی سے ہے اور اللہ بخش کے انکشاف کے بعد وہ گلاب خان کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ تمہیں بہت زیادہ ہوشیار

رہنا ہوگا۔"

"آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں سر!" میں نے بڑے عزم سے کہا۔ "میں بہت جلد آپ کو خوشخبری سناؤں گا۔"

"ویری گڈ!" انہوں نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا۔ "تم جو بھی لائحہ عمل ترتیب دو...... میرا مشورہ ہے کہ اللہ بخش کو نظر انداز نہیں کرنا۔"

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں سر۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس مشن میں اللہ بخش کو ایک لمحے کیلئے بھی فراموش نہیں کروں گا۔"

"شاباش!" وہ گردن کی اثباتی جنبش کے ساتھ بولے۔ "اگر اس کام کیلئے تمہارے تھانے کی نفری کم پڑ رہی ہو تو میں کوئی اور بندوبست کرتا ہوں......"

"نہیں سر...... میں کام چلا لوں گا۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" ایس پی صاحب نے کہا۔

میں ان سے رخصت لے کر ہیڈ کوارٹر سے نکل آیا۔ ضلعی ہسپتال بھی تھوڑے فاصلے پر واقع تھا۔ میں ایک سوچ کے زیر اثر سرکاری ہسپتال پہنچ گیا۔

میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے ملاقات کی اور اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ مذکورہ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ متوفی رانی کا پوسٹمارٹم ہو چکا ہے اور ابتدائی رپورٹ بھی تیار ہے۔ آج دوپہر کے بعد لاش کو ہسپتال سے روانہ کرنے کا ارادہ تھا۔

"میں اتفاق سے ادھر آ ہی گیا ہوں تو لاش کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔" میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے کہا۔ "اگر اس میں آپ کی طرف سے کوئی انتظامی رکاوٹ نہ ہو تو......؟"

"کوئی رکاوٹ نہیں ہے!" ڈیوٹی ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "بس، آپ کو لگ بھگ آدھا گھنٹہ انتظار کرنا ہوگا...... کچھ ضروری بندوبست کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں آدھے گھنٹے کے بعد آ جاتا ہوں۔" میں نے کہا "جب تک ادھر شہر میں ایک دو کام ہیں، انہیں نمٹا لیتا ہوں۔"

واضح رہے کہ اس روز میرے اور ایس پی صاحب کے درمیان گلاب خان اور اس کے سرغنہ کے حوالے سے خاصی تفصیلی بات چیت ہوئی تھی۔ لہٰذا بنا کسی ٹھوس ثبوت کے اس پر

ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ میں نے ایس پی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ میں انہیں گلاب خان کی گرفتاری کی شکل میں ایک ٹھوس ثبوت فراہم کروں گا۔

میں آدھے پونے گھنٹے تک شہر میں ادھر ادھر گھومتا رہا، پھر رانی کی پوسٹمارٹم شدہ لاش کے ساتھ سعید آباد آ گیا۔ میں نے تھانے جانے کے بجائے سیدھا رانی کے گھر واقع پرانا سعید آباد کا رخ کیا تاکہ رانی کی لاش کو اس کے ورثاء کے حوالے کر سکوں۔ اس طرح وہ تھانے آنے اور لاش لے جانے کی زحمت سے محفوظ رہتے۔

میں نے مختلف کاغذات پر شوکت علی کے دستخط لے کر قانونی تقاضے پورے کئے اور واپس تھانے آ گیا۔ پوسٹمارٹم کی ابتدائی رپورٹ میں نے واپسی کے سفر کے دوران ہی پڑھ لی تھی۔ جس کے مطابق رانی کی موت اس کے اغوا کے بعد آنے والی رات کو واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کا وقت نصف شب کے آس پاس بتایا گیا تھا اور سبب کے ذیل میں درج تھا کہ متوفی کا سر بڑے طوفانی انداز میں کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا تھا جس کے نتیجے میں وہ زندگی ہار بیٹھی تھی۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے میں نے اے ایس آئی جمشید خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ آ کر میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔

"جمشید خان! کام کیسا چل رہا ہے؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس ملک صاحب۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تمہارا کام بڑھانا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "گھبرا تو نہیں جاؤ گے؟"

"بالکل نہیں جناب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہمارے تھانے میں تو ویسے بھی کام بہت کم ہوتا ہے...... مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر آپ مجھے کوئی مشن سونپ دیں گے۔"

"بس...... تو سمجھ لو، آج سے...... بلکہ ابھی سے آٹھ دس دن کیلئے تم ایک خصوصی مشن پر ہو۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "لیکن یہ مشن ان ڈور ہوگا۔ اس تھانے کی چار دیواری کے اندر......!"

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب!"

”میں آنے والے چند روز بہت مصروف رہوں گا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔”اکثر مجھے تھانے سے باہر کارروائی کیلئے جانا پڑے گا اور میرے غیاب میں تم یہاں کے تھانہ انچارج ہوگے۔“

”اوہ......!“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔”میرے لئے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔“

”اب اس اعزاز کی حفاظت کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا۔
”یہ تمہاری نیٹ پریکٹس ہے......آخر‘ آگے چل کر ایک دن تمہیں تھانیدار بھی تو بننا ہے۔“

”ملک صاحب! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“ اس کی باچھیں کھل گئیں۔

”آمین!“ میں نے تہِ دل سے کہا۔



یہ رانی کی تدفین کے تین روز بعد کا واقعہ ہے۔ میں تھانے میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا۔ وہ شام کا وقت تھا۔ مجھے اطلاع ملی کہ کانسٹیبل اسلم مجھ سے ملنے آیا ہے۔ اسلم کے اکیلے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم خبر لایا ہوگا اور وہ خبر یقیناً گلاب خان سے متعلق ہوگی۔

میں نے اسلم کو اپنے پاس بلا کر استفسار کیا تو اس نے بتایا۔”ملک صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ تین گھڑسوار رب نواز کے ہوٹل کے پاس سے گزر کر کھیتوں والے راستے کی طرف گئے ہیں۔“

میں اس سنسنی خیز اطلاع کے بعد ریڈ الرٹ ہوگیا اور کانسٹیبل اسلم سے پوچھا۔”ان لوگوں کو آپ دونوں کی نگرانی کے حوالے سے کوئی شک تو نہیں ہوا؟“

”بالکل نہیں ملک صاحب!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”کیا ان لوگوں نے گھوڑوں پر کوئی سامان وغیرہ بھی لاد رکھا تھا؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

اسلم نے اثبات میں گردن ہلائی۔”جی ملک صاحب! گھوڑوں پر دو بڑے بیگ بھی موجود تھے......“

”ٹھیک ہے‘ تم واپس ارشاد کے پاس جاؤ۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔”آج کی

رات تم کو جاگ کر ڈیوٹی دینا ہے......اگر وہ گھڑسوار افراتفری میں واپس آتے دکھائی دیں تو انہیں قابو کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ وہ بچ کر نہیں جانا چاہئیں۔ ان پر گرفت حاصل کرنے کیلئے گولی شولی بھی چلانا پڑے تو ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرنا......تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا......؟“

”جی ملک صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔”ان کو قابو کرنے کے سلسلے میں آپ کا حکم تو اچھی طرح سمجھ میں آ رہا ہے مگر وہ افراتفری میں واپس کیوں آئیں گے......؟“

”اس سلسلے میں تمہیں اپنے دماغ کو تھکانے کی ضرورت نہیں اسلم!“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔”تھکے ہوئے دماغ کے ساتھ تم چوکس رہ کر ڈیوٹی نہیں دے سکو گے۔ بس‘ اتنا سمجھ لو کہ......“ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی‘ پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں آج کی رات ہانکا کرنے جا رہا ہوں......!“

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور مجھے سلام کرکے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے اے ایس آئی جمشید خان کو اپنے پاس بلا کر چند ہنگامی ہدایات دیں‘ پھر ضروری تیاری کے بعد پرانا سعید آباد کی جانب روانہ ہوگیا۔

جب میں نے اللہ بخش کو بتایا کہ آج کی رات وہ بھی مشن گلاب خان میں میرے ساتھ ہوگا تو وہ خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ ہم نے شبنم کو شوکت علی کے گھر پر چھوڑا اور پیر جھنڈے شاہ کے مزار کی جانب روانہ ہوئے۔

میں نے متروکہ ڈیرے تک رسائی حاصل کرنے کیلئے وہی راستہ اختیار کیا تھا جو پرانا سعید آباد سے موضع چاند نگر کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے سے ہم پہلے بھی پیر جھنڈے شاہ کے آستانے پر جا چکے تھے۔ وہاں پر میں نے پہلے ہی کانسٹیبل صفدر اور فرید کو تعینات کر رکھا تھا۔ اس روٹ کو اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ گلاب خان اینڈ کمپنی پر ادھر سے دھاوا بولنا زیادہ سودمند ثابت ہوتا‘ پھر دوسری جانب یعنی رب نواز کے ہوٹل کی طرف میں نے کانسٹیبل اسلم اور ارشاد کو چوکنا کر دیا تھا لہٰذا گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کے ادھر سے فرار ہونے

کا خطرہ نہیں تھا۔

راستے بھر میرے اور اللہ بخش کے درمیان گلاب خان کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی تھی۔ میں اس سے پہلے اس ڈیرے کا جو سروے کر کے گیا تھا اس کے بارے میں اللہ بخش کو تفصیلاً بتا چکا تھا لہٰذا وہ کچھ زیادہ ہی جوشیلا ہو رہا تھا۔

ہم نے پیر جھنڈے شاہ کے مزار سے صفدر اور فرید کو اپنے ساتھ لیا اور لگ بھگ دس بجے رات اس ڈیرے کے قریب پہنچ گئے جسے پچھلے کچھ عرصے سے گلاب خان اور اس کے ساتھیوں نے اپنا اڈا بنا رکھا تھا۔ راستے میں‘ میں نے صفدر اور فرید کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔

ڈیرے کے اندر اور باہر سناٹے کا راج تھا۔ باہر سناٹے کا سبب تو سمجھ میں آتا تھا لیکن اندر کی خاموشی مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ صفدر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

’’ملک صاحب! ہوسکتا ہے‘ وہ لوگ ادھر آئے ہی نہ ہوں......‘‘

’’یہ نہیں ہوسکتا......!‘‘ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

اللہ بخش نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ’’تھانیدار صاحب! آپ تینوں کے بدن پر پولیس کی وردیاں ہیں جبکہ میں عام دیہاتی لباس میں ہوں۔‘‘

’’پھر......؟‘‘ میں نے سوالیہ نظر سے اللہ بخش کی طرف دیکھا۔

’’میں گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کو ان کے بل سے نکالنے کی کوشش کرسکتا ہوں۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

’’لگتا ہے‘ تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے......؟‘‘ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

’’جی ہاں......!‘‘ اس نے بڑے اعتماد سے اثبات میں گردن ہلائی‘ پھر بولا۔ ’’آپ لوگ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جائیں اور بالکل چوکنا رہیں۔ میں ڈیرے کا گیٹ کھلوانے کی کوشش کرتا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے...‘‘ میں نے اللہ بخش کو تجربے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ’’تم کوشش کر کے دیکھ لو......‘‘

اللہ بخش ہمیں اندھیرے میں چھوڑ کر‘ ڈیرے کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ہم تینوں

ایسے زاویے پر کھڑے تھے جہاں سے ڈیرے کا گیٹ صاف نظر آ رہا تھا لیکن گیٹ میں کھڑے ہو کر ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اللہ بخش نے گیٹ پر پہنچ کر خاصی زوردار دستک دی۔ میرے ذہن میں ایک خدشے نے سر اٹھایا۔ ایس پی صاحب کے الفاظ میری سماعت میں گونجنے لگے۔

’’اللہ بخش پر خصوصی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ گلاب خان اور اس کے سرغنہ کے بارے میں اس کی معلومات بڑی حیرت انگیز ہیں...... ہوسکتا ہے‘ اللہ بخش کا کنکشن انہی لوگوں سے ہو۔‘‘

’’اول تو ایسا ہے نہیں کیونکہ میری نظر بندے کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتی۔‘‘ میں نے اپنی سوچ میں خود سے کہا۔ ’’اور اگر ایسا ہے تو پھر میں...... میں اللہ بخش کا حشر گلاب خان سے بھی زیادہ عبرتناک کروں گا......‘‘

میرے ذہن میں ایک منفی سوچ ابھری۔ ’’اگر اللہ بخش نے گلاب خان کو خفیہ اشارہ دے کر کوئی گڑبڑ کر دی تو......؟‘‘

میں نے فوراً سے پیشتر سر جھٹک دیا۔ ’’ایسا کچھ نہیں ہوگا......‘‘

اللہ بخش کی زوردار دستک پر جب اندر سے کوئی ردعمل نہیں آیا تو اس نے دوسری دستک کے ساتھ باآواز بلند پکارا۔

’’بھائی...... اندر کوئی ہے... میں راستہ بھٹکا ہوا مسافر ہوں... کوئی میری مدد کرے......‘‘

اللہ بخش کی اس کوشش پر اندر سے جو جواب آیا‘ اس نے مجھ سمیت صفدر اور فرید کو بری طرح چونکا دیا۔ وہ ایک آواز تھی...... جانی پہچانی آواز... گھوڑوں کے ہنہنانے کی مخصوص آواز یعنی...... ہنہناہٹ......!

اس ہنہناہٹ نے ثابت کر دیا کہ اندر چند گھوڑے موجود ہیں جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ گھڑسوار بھی اندر موجود ہیں جن کی تلاش میں پچھلے چند روز سے میں سرگرداں تھا۔

میں نے صفدر اور فرید کو اشارہ کیا وہ ڈیرے کے عقبی حصے کی جانب چلے جائیں۔ میں سامنے سے دھاوا بولتا ہوں۔ اگر ان لوگوں نے پچھلے حصے سے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ انہیں سنبھال لیں گے۔ وہ میرا اشارہ سمجھ کر مذکورہ سمت بڑھ گئے۔ میں اللہ بخش کے پیچھے تھوڑا

فاصلہ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ گیٹ پر نمودار ہونے والا شخص فوری طور پر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اللہ بخش نے ایک مرتبہ پھر زوردار دستک دی اور فریادی لہجے میں پکارا۔

”بھائی گیٹ کھولو...... اور میری مدد کرو...... میں ایک بھولا بھٹکا پردیسی ہوں۔ مجھے راستہ سمجھا دو......“

تھوڑی دیر کے بعد گیٹ کھلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ میں نے اپنا روسی ریوالور نکال لیا۔ اگلے ہی لمحے بہ آہستگی گیٹ کھلا اور کسی نے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اس کی کوشش کو ناکام بنانے کیلئے مجھے بس اتنی ہی مہلت درکار تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ شخص اللہ بخش سے کسی نوعیت کی گفت وشنید کا آغاز کرتا‘ میں نے ایک زوردار دھکا دے کر گیٹ کا پٹ اس کے منہ پر کھول دیا۔ وہ بلبلاہٹ کی آواز خارج کرتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔ میں بھرا مار کر ڈیرے کے اندر داخل ہو گیا۔

اسی لمحے کمروں کی جانب سے آواز ابھری۔ ”مراد...... کون ہے باہر؟“

گیٹ کا ”تھپڑ“ کھا کر گرنے والا مراد بڑا ہی نامراد ثابت ہوا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود بھی اس نے میری وردی کو ٹھیک طرح سے دیکھ لیا تھا۔ اپنے ساتھی کے سوال کے جواب میں وہ چلایا۔

”گلاب خان...... پولیس آئی ہے......!“

”پولیس......؟“ گلاب خان بس اتنا ہی کہہ سکا۔

گلاب خان کی حیرت اور بے یقینی میں ڈوبی ہوئی آواز نے مجھے بتا دیا کہ وہ ڈیرے سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک ہوائی فائر کیا‘ پھر گرج کر کہا۔

”کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ اس ڈیرے کو پولیس کے جوانوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ جو بھی مہم جوئی کرے گا‘ حرام موت مرے گا......“

پھر میں نے مراد کی کمر پر ٹھڈا رسید کرتے ہوئے کہا۔

”اٹھ...... کھڑا ہو جا۔“

اسی لمحے کچھ ایسی آوازیں ابھریں جیسے گلاب خان اور اس کا دوسرا ساتھی میری دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ڈیرے کے عقبی حصے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میں

نے ایک فوری فیصلے کے تحت مراد نامی غنڈے کی ٹانگ پر فائر کیا اور اللہ بخش سے کہا۔

”تم اس کا خیال رکھو...... میں دوسروں کی خیریت پوچھ کر آتا ہوں۔“

پھر میں کمروں کی جانب لپک گیا۔ میں نے انہیں دھمکی تو دی تھی کہ جب بھی بھاگنے کی کوشش کرے گا‘ بے موت مرے گا لیکن میں اس لمحے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایسی کوئی کوشش کریں اور صفدر وفرید کو کاروائی ڈالنا پڑے۔

جب میں ڈیرے کے عقبی حصے میں بنے کمروں تک پہنچا تو میں نے دیکھا دو افراد دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں۔ وہ دونوں دردناک آواز خارج کرتے ہوئے دھڑام سے ڈیرے کے اندرونی حصے میں گرے۔ میں نے فائر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ان کے جسم کا زیریں حصہ ہی متاثر ہو۔

میں بھاگ کر ان کے سر پر پہنچ گیا اور ٹارچ جلا کر ان کا معائنہ کرنے لگا۔ اتنی دیر میں صفدر اور فرید بھی ڈیرے کے اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے فوری کارروائی کے طور پر مراد کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اللہ بخش میری جانب لپکا اور زمین پر پڑے دو افراد میں سے ایک مچھل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔

”ملک صاحب...... یہی ہے گلاب خان......!“

آئندہ پانچ منٹ کے اندر اندر ان تینوں غنڈوں کو الٹی ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں‘ پھر میں نے کمروں کی تلاشی لی اور وہ دو بڑے بیگ دریافت کر لئے‘ جن کے بارے میں کانسٹیبل اسلم نے مجھے بتایا تھا۔

میں نے بیگ کھول کر دیکھے تو دنگ رہ گیا۔ ایک بیگ کے اندر خطرناک اسلحہ بھرا ہوا تھا جبکہ دوسرا بیگ منشیات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ تینوں مجرم اپنے خطرناک جرم کے ثبوتوں کے ساتھ میری گرفت میں آ چکے تھے۔ لہٰذا مجھے اپنا کام کرنے کیلئے اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ گلاب خان کے دوسرے ساتھی کا نام ایوب تھا۔

ان تینوں زخمی غنڈوں اور ان کے جرائم کے ثبوت کو لے کر میں رات کے آخری پہر اپنے تھانے پہنچ گیا۔ واپسی کیلئے ہم نے وہ راستہ اختیار کیا تھا جدھر اسلم اور ارشاد تعینات تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جب گلاب خان اور ایوب دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش

کر رہے تھے تو ان کے پاس ہتھیار بھی موجود تھے لیکن میں نے انہیں گولی چلانے کی مہلت نہیں دی تھی۔ میرے ریوالور سے نکلنے والی گولیوں نے گلاب خان کی تشریف اور ایوب کے ٹخنے کو لہولہان کر دیا تھا جبکہ مراد کی ران مسلسل خون اگل رہی تھی۔



مجھے گلاب خان اور اس کے ساتھی غنڈوں پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ وہ بری طرح زخمی تھے اور میں نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ جب تک وہ اقبالی بیان نہیں دیں گے میں ان کی مرہم پٹی کا بندوبست نہیں کروں گا۔ ان کے پاس میری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

جب میں نے گلاب خان مچھل سے رانی کی موت کے حوالے سے سوال کیا تو اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اسے میں نے نہیں مارا۔''

''وہ اپنی موت خود کیسے مر گئی......؟''

''میں اس کی عزت خراب کرنا چاہتا تھا اور وہ خود کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش میں تھی۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''اسی چھینا جھپٹی میں اسے ایک زوردار دھکا لگا اور اس کا سر ایک دیوار سے جا ٹکرایا......بس' وہ ادھر ہی گر گئی اور......مر گئی......!''

''رانی تو مر گئی' بچو گے تم بھی نہیں......'' میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''تم جس کے خاص آدمی ہو ہم جانتے ہیں۔ میں نے تمہیں تمہارے جرائم کے ثبوت کے ساتھ گرفتار کیا ہے۔ تمہاری باقی کی زندگی جیل کی دیواروں کے پیچھے گزرے گی۔ میں اتنا سخت چالان بناؤں گا کہ تمہارا سرغنہ تو کیا' اس کا باپ بھی تمہیں نہیں چھڑا سکے گا......''

وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

